گل دستہ

یعنی

مجموعہ کلام نظم و نثر بہ سلسلہ آل انڈیا مشاعرہ و ادبی کانفرنس بجنور

منعقدہ ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

حسب ایماء

جناب خان بہادر سید احمد علی صاحب بالقابہ کلکٹر و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

بجنور

مرتبہ

خواجہ زکریا فیاضی

ایم اے، ال، ال، بی (علیگ)

وکیل - بجنور

فہرست مضامین

ب

S. Ahmad Ali Esq., K. B.
District Magistrate, Bijnor

گلدستہ

سنہ ۱۹۴۴ء

سخن ہائے گفتنی

آل انڈیا مشاعرہ اور ادبی کانفرنس منعقد کرنیکا تخیل خان بہادر سید احمد علی صاحب کلکٹر ضلع کے دماغ کا رہین ہے۔ موصوف کی شعر و ادب سے دلچسپی مسلم ہے طبیعت نکتہ رس و دقیقہ سنج پائی ہے۔ فرائض متعلقہ کی گوناگوں مصروفیتوں اور اہم ذمہ داریوں کے باوصف لمحات فرصت کو ادبی مشاغل میں صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

جنگی کوششوں کو ضلع میں سرسبز بنانے کے لئے موصوف نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ان مساعی کو تیز تر کرنے کے لئے ۱۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء کو ایک جلسے میں قرار پایا کہ آخر ہفتہ نومبر میں وار ویک (ہفتہ جنگ) منایا جائے۔ اور اس سلسلہ میں ایک شاندار مشاعرہ اور ادبی کانفرنس بھی ۲۷ و ۲۸ر نومبر کو منعقد کی جائے۔

اخراجات کے لئے روپیہ کی فراہمی کی غرض سے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں ضلع کے سربرآوردہ حضرات نے کام کرنیکا بیڑا اٹھایا۔ مشاعرہ اور ادبی کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف کمیٹیاں ظہور میں آئیں اور کام تیز رفتاری سے شروع ہوگیا۔ انتظامات کے پیش نظر یقین ہوتا تھا کہ ہر دو اجتماع بہت کامیاب رہیں گے لیکن مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ خان بہادر صاحب نومبر کے دوسرے ہفتے میں یکایک شدید علالت میں مبتلا ہوگئے اور انھیں بغرض علاج باہر جانا پڑا۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ ادبی کانفرنس اور مشاعرہ کو بادل ناخواستہ ملتوی کرنا پڑ گیا لیکن چونکہ اہل قلم حضرات کو دعوت دیجا چکی تھی اس نادر ادبی اجتماع پر کلیتہً مہر اختتام لگا دینا مناسب نہ سمجھا گیا۔ اور خان بہادر صاحب کی واپسی کا انتظار کیا گیا۔ علالت نے طول پکڑا۔ اور مسٹر ایس اکرام الحق آئی سی ایس بحیثیت کلکٹر تشریف لے آئے۔ انھوں نے مشاعرہ کے پروگرام کو از سر نو کامیاب بنانے کا یقین دلایا۔ چنانچہ ۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۴۴ء ادبی کانفرنس اور مشاعرہ کے لئے مقرر ہوگئی۔ ملک کے مشہور اہل قلم اور صاحب سخن حضرات کو دوبارہ شرکت کی دعوت دی گئی۔ اور بنظر سہولت انتظام حسب ذیل کمیٹیاں بنائی گئیں۔

(۱) خط و کتابت۔ بذمہ مسٹر کے سی جوشی (ڈپٹی کلکٹر) مسٹر سید حامد (ڈپٹی کلکٹر) و خواجہ زکریا فیاضی (وکیل)

(۲) قیام و طعام۔ زیر نگرانی مولوی محمد عسکری (ڈپٹی کلکٹر)

(۳) زینت و آرائش ہال۔ زیر انتظام مسٹر بی این کھنہ (ڈپٹی کلکٹر) مسٹر پردھان (تحصیلدار) و سید سردار علی (نائب تحصیلدار)

(۴) استقبالیہ کمیٹی:۔ نگینہ، نجیب آباد اور بجنور اسٹیشنوں پر مہمانوں کے استقبال کے لئے کمیٹیاں بنائی گئیں۔

۳۰ و ۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو اہل قلم حضرات کی آمد شروع ہوئی۔ قیام و طعام کا انتظام ایک کشادہ اور پرفضا کوٹھی میں کیا گیا اور شکر ہے کہ مہمانان محترم کو نہ صرف کوئی وجہ شکایت پیدا نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنے آرام و آسائش کے لئے منتظمین مشاعرہ بالخصوص عسکری صاحب کے بہت ممنون نظر آئے۔

ادبی کانفرنس ۳۱ تاریخ کو دو بجے سہ پہر سے چھ بجے تک اعجاز علی ہال میں ادبی کانفرنس کا اجلاس ہوا جسکی صدارت جناب رائے بہادر رام بابو سکسینہ صاحب نے کی۔ رائے بہادر صاحب کی ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، وہ دنیائے ادب میں ایک ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ موصوف نے ایک ادبی مقالہ بطور خطبہ صدارت پڑھا جس میں ادب اردو کے موجودہ رجحانات پر نظر افروز تبصرہ تھا۔ اسکے بعد جناب مولوی ضیا احمد صاحب بدایونی، جناب سلطان زماں صاحب تحصیلدار نجیب آباد، جناب سید حامد صاحب ڈپٹی کلکٹر اور جناب خواجہ ذکریا فیاضی صاحب وکیل نے اپنے اپنے مضامین پڑھ کر سنائے۔ جناب پروفیسر جاں نثار صاحب اختر نے ایک مختصر مگر دلچسپ تقریر میں جدید ادبی لٹریچر ایک خاص اور نئے نگاہ سے روشنی ڈالی۔ حاضرین نے تمام مضامین کو بغور سنا اور پسند کیا۔

افسوس ہے کہ جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی، جناب آل احمد سرور، جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق، جناب مجنوں گورکھپوری اور جناب پروفیسر مسعود الحسن ادیب۔ اپنی چند در چند مصروفیتوں کے باعث شریک اجتماع نہ ہو سکے جس کا منتظمین کو سخت قلق رہا۔ یہ مضامین گلدستہ میں ادبی مقالات کی شکل میں موجود ہیں۔ — افسوس ہے کہ صدر صاحب کا خطبہ طباعت کے لئے دستیاب نہ ہو سکا۔ اجلاس ختم ہونے پر معزز مہمانان حاضر کا ایک فوٹو گروپ لیا گیا۔ جناب سیماب اکبرآبادی، خان صاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری، جناب روش صدیقی، جناب نخشب جارچوی اور جناب شعری بھوپالی جو اسی وقت تشریف لائے تھے اور سفر کی تکان سے مضمحل تھے شریک فوٹو نہ ہو سکے جس کا سب کو تاسف رہا۔

مشاعرہ رات کو نو بجے اعجاز علی ہال میں مشاعرہ شروع ہوا۔ ہال اپنی زیبائش و زینت کے لحاظ سے عروس نو بنا ہوا تھا۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا۔ ایسا عظیم الشان اجتماع ۰۰۰ اہالیان بجنور نے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ ضلع و بیرون ضلع کے کثیر التعداد اہل ذوق حضرات شعرائے کرام کا کلام سننے اور داد سخن دینے کو جوق در جوق ہال میں جمع ہو گئے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ خواتین نے بھی کافی تعداد میں شرکت کی جنکے لئے گیلری میں معقول انتظام کر دیا گیا تھا۔ طبع آزمائی کے لئے مصرعہ ہائے طرح حسب ذیل دیئے گئے تھے۔

۱۔ کسی سے چارۂ بیداد آسماں نہ ہوا۔ ۲۔ سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں۔

مشاعرے کی صدارت کے فرائض جناب سر سید رضا علی صاحب نے انجام دیئے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی صدارت بہت کامیاب رہی۔ انکی اشعار کی داد اور بیچ بیچ میں جستہ جستہ فقرے یادگار رہیں گے جس نے مشاعرے کو باوجود شدت موسم سرما صبح کے چار بجے تک گرم و دلآویز بنائے رکھا۔ مشاعرہ کی ابتدا بجنور کے صغیر السن شاعر شمیم نے کی جو مسلم اسکول بجنور میں درجہ چار میں زیر تعلیم ہیں اور انتہا رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی کے کلام پر ہوئی۔ مشاعرہ کے خاتمہ پر حضرت جگر کے آخری شعر (مقطع) نے بڑا لطف دیا حاضرین کے دلی جذبات کی تصویر کھینچدی شعر ملاحظہ ہو۔

قریب منزل آخر ہے الفراق جگر سفر تمام ہوا نیند آئی جاتی ہے

شعرا کے کلام پر مناسب تبصرہ جناب سید حامد کے پیش لفظ میں ملے گا۔

آخر میں میں اُن تمام حضرات ذوی القدر کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے ہر دو اجتماع کو کامیاب بنانے میں دامے، درمے، سخنے مدد دی۔ بالخصوص صدر صاحبان، شعرائے کرام و اہل قلم حضرات کا جنھوں نے ہماری معروضات کو شرف قبولیت اور اہل بجنور کو اپنے کلام فیض التیام سے لذت اندوز ہونے کا موقع دیا۔ میں جناب خانبہادر صاحب جناب ایس اکرام الحق صاحب۔ جناب کرشن چندر جوشی صاحب، جناب محمد عسکری صاحب، جناب مدحت کاظمی قدوائی صاحب، جناب اودھ بہاری لال ماتھر صاحب، جناب سید حامد صاحب، جناب برج نرائن کھنہ صاحب، جناب کرشن بہادر بیدھان صاحب، جناب سید سردار علی صاحب اور جملہ اراکین کمیٹی ہائے مختلف کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہر دو اجتماع کو کامیاب بنانے کی انتھک کوششیں کیں۔ میں جناب خانبہادر سید احمد علی صاحب کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے شعرا کے کلام کو جو بر وقت قلم بند کر لیا گیا تھا بڑے شوق کے ساتھ سُنا اور اس گلدستہ کی اشاعت کا انتظام فرمایا۔ افسوس ہے کہ گلدستہ میں حسب ذیل حضرات کا کلام شامل نہ ہو سکا۔

رفعت وقمر بجنوری۔ رعنا۔ آغا سرخوش دہلوی۔ اختر الایمان۔ روشن صدیقی۔ جناب فیض جھنجھانوی کی صرف دو رباعیاں صحیح ملیں۔

گو زیر سرکردگی مرتب گلدستہ ہٰذا جناب مشتاق نبی خاں اور جناب انتصار احمد۔ اہلکاران کلکٹری نے شعرا کے کلام کو قلمبند کیا اور محنت و دلچسپی سے اپنے فرائض کو انجام دیا پھر بھی بعض بزرگوں کا پورا کلام سپرد قلم ہونے سے رہ گیا اور باوجود یاددہانی ان حضرات نے اپنا کلام اشاعت کے لئے ارسال کرنا پسند نہ فرمایا۔ اس لئے گلدستہ کی قلمکاری و چمن بندی زیادہ تر اُن قلمی کاوشوں کی مرہون ہے جو بر وقت کی گئی تھیں۔ اغلاط و اسقام کو دور کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے لیکن بمصداق الانسان مرکب من الخطاء و النسیان۔ اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو راقم السطور معذرت خواہ ہے۔

افسوس ہے کہ محترمی سید حامد جو علیگڈھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ سخن سنج و سخن گو ہیں اور انتقادیں باریک نگاہ رکھتے ہیں اور جو مشاعرہ کے انتظام و کامیابی کے بحیثیت سکریٹری ذمہ دار تھے اس ضلع سے بدل گئے اور اس گلدستہ کی ترتیب، طباعت و اشاعت کا کام اس خاکسار کے سپرد ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر سید حامد صاحب اس چمن کی آبیاری اپنے دست ادا شناس سے کرتے تو گلہائے رنگا رنگ کھلا دیتے۔ بہرحال میں اپنی کوششوں کو قارئین کرام کی خدمت میں بشکل گلدستہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ ع

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

خواجہ زکریا فیاضی

بجنور

پیش لفظ

مشاعرے آئے دن ہوتے ہیں، اور بعض بعض بڑے تزک و احتشام کے ساتھ۔ انکا اشتہار ملک کے طول و عرض میں ہوتا ہے اور ایتھر کے بازوؤں پر شعرا کی آواز بھی ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پہنچ جاتی ہے لیکن وہ مشاعرہ جو بجنور میں گذشتہ جنوری اور فروری کی درمیانی شب میں ہوا باوجودیکہ نشر و اشتہار دونوں سے محروم رہا۔ لوگوں کو عرصہ تک یاد رہیگا۔ کیونکہ دوسرے مشاعروں سے یہ کچھ مختلف تھا۔

بجنور۔ یوپی کے شمال و مغربی حصہ میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جو ارد و ادب سے ڈاکٹر نذیر احمد اور عبدالرحمٰن بجنوری کے وطن اور مولد کی حیثیت سے روشناس ہے۔ ان ہی بزرگ ارواح کی برکت سمجھئے کہ اس قصبہ میں شعر و ادب کے نام لیوا اب بھی موجود ہیں۔ وقتاً فوقتاً مشاعرہ ہوتے رہتے ہیں جو ادبی ذوق کے بجھتے ہوئے انگاروں کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ ایک بزم ادب ہے۔ جہاں قصبہ کے پڑھے لکھے مل بیٹھتے ہیں مقالات لکھتے ہیں اور سناتے ہیں یہ لوگ خاموشی سے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ مقامی شعرا کی فہرست کافی طویل ہے۔ افسوس ہے کہ بیشتر ابھی غزل پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ انھیں علم ہی نہیں کہ وہ بساط الٹ چکی اور شاعری کا نیا دور شروع ہو گیا ہے۔ اور جنھیں علم ہے وہ یا تو نئی شاعری کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں یا تن آسانی کے باعث غزل کے پیٹے تلے کوچہ سے قدم باہر نکالنا پسند نہیں کرتے۔ ذوق ہے مگر بھٹکا ہوا۔ ضرورت تھی کہ ان کے سامنے کچھ ایسی مثالیں پیش کی جاتیں جو انھیں ایک طرف تو اپنے طرز میں تنوع کا سبق دیتیں اور دوسری طرف نئے انداز میں کہنے کی تحریک کرتیں۔ انکے سامنے نئی شاہراہیں کھول دیتیں۔ انکی نظر کو وسعت عطا کرتیں۔ ہم اسی مشاعرہ کی کامیابی کی کسوٹی سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہنگامی نوعیت کے مشاعرہ کہاں نہیں ہوتے اور کب نہیں ہوتے؟

جنگ اور محبت میں سب کچھ روا ہے، لہٰذا مشاعرہ بھی روا ہی نہیں بعض اوقات ضروری بھی ہے محبت کے لئے تو مشاعرہ اور شاعری ناگزیر ہیں پہلے جنگوں میں بھی رجز خوانی کے بغیر کام نہیں چلتا تھا اور اب رجز خوانی میدان جنگ میں نہیں۔ اس سے پہلے اور اس سے دور شہر و قصبات اور دیہات میں ہوتی ہے ساور سچ تو یہ ہے کہ جنگ کی لغتیں ہمارے گھروں تک پھیل گئی ہیں حکومت ہند نے شاعری اور موسیقی دونوں سے پرچار کا کام لینا شروع کر دیا ہے لیکن شاعری اور جنگ کا رشتہ اس سے زیادہ قوی اور قدیم ہے۔ محبت کے بعد دنیا کی اعلیٰ ترین نظمیں جنگ سے متعلق رہی ہیں۔ علاوہ بریں شعر کا روئے سخن ہمارے جذبات شریفہ سے ہوتا ہے۔ انہی جذبات جن سے کبھی تو "جگر لالہ میں ٹھنڈک" پڑتی ہے اور کبھی "دریاؤں کے دل ہل جاتے ہیں"۔۔۔۔ شعر ہمیں تھوڑی دیر کے لئے کاروباری مخمصوں اور فکر معاش سے نجات دیدیتا ہے اور ہماری اُن قوتوں کو جنگی مساعی جنگ کے لئے ضرورت ہے تازہ دم کرتا ہے۔ اسی طرح اگر مشاعرہ کو تفنن طبع اور تفریح سے زیادہ اہمیت نہ دیجائے تو بھی وہ بالواسطہ مساعیٔ جنگ سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ اب قارئین ہمارے مشاعرہ اور ہفتۂ جنگ کے اتحاد کو بھان متی کا کنبہ نہ سمجھیں گے۔

ہمارے مشاعرہ عام طور پر کسی خاص اسکول کی نمایندگی کرتے ہیں ترقی پسندوں کے مشاعروں میں پرانی روش کے شاعروں کو دعوت نہیں

دیہاتی اور پُرانے طرز کے شاعروں کے ساتھ ترقی پسند شعرا پڑھنا گوارا نہیں کرتے لیکن گلدستہ شاہد ہے کہ بجنور کے مشاعرہ میں دونوں اسکول کے شعرا نے شرکت کی نظمیں بھی پڑھی گئیں اور غزلیں بھی نظموں میں کافی تنوع ہے موضوعی اور عروضی دونوں اعتبار سے۔ اصناف سخن میں سے قصیدہ اور مستزاد کو چھوڑ کر ہر صنعت سخن کی نمایندگی ہوگئی ہے پُرانے اسکول کے نمایندوں میں سیماب اکبرآبادی۔ جگر مرادآبادی اساتذہ میں وحشیؔ کانپوری اور حمیدؔ لکھنوی کہنہ مشق شعرا میں خمارؔ بارہ بنکوی نخشب جارچوی شکیل بدایونی یوسف علیگ، رازؔ مرادآبادی صابرؔ دہلوی شہرتؔ بھوپالی، اخضرؔ بالوی۔ نظرؔ امروہوی نوجوانوں میں (لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ حضرات قطعاً پرانے اسکول سے وابستہ ہیں یا ان سب کا علیحدہ کوئی اسکول ہے، پُرانے اسکول سے مراد وہ شعرا ہیں جن کے کلام کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے اور جو ترقی پسند ادب سے کوئی خاص نسبت نہیں رکھتے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جگر مرادآبادی اور سیماب اکبرآبادی دونوں الگ الگ اسکولوں کے بانی ہیں) اور ادب جدید میں حفیظ جالندھری جو ہماری شاعری میں گیتوں کے مروج اور ایک حد تک مخترع ہیں، جاں نثار اختر، انتہا بھیپن، مجروح سلطانپوری، فیض جھنجھانوی اور اختر الایمان، ان کے بین بین احسان اور روش صدیقی دوآبہ میں ہیں۔ اور پُرانے اور نئے دونوں دھاروں سے اپنی کشت کی آبیاری کر رہے ہیں وہ ایک طرف تو پُرانے اسکول کے استبداد اور قیود سے اور دوسری طرف نئے اسکول کی بے راہ روی اور بے اعتدالیوں سے محفوظ ہیں۔ ان ہی کے ساتھ سرخوش دہلوی بسمل شاہجہانپوری ہیں۔ سنجیدگی سے طبیعت اکتانے لگے تو تبدیل ذائقہ کے لئے عطاء اللہ خاں غزاؔل کا مزاحیہ کلام سنئے۔ موصوف کا دم بجنور میں بڑا غنیمت ہے کہنے کو تو کچہری میں اردلی ہیں مگر آن بان ٹھاٹ اور تیور رئیسوں کے سے ہیں گنگا جمنی خوب کہتے ہیں، ان کے یہاں Anticlimax کی اچھی اچھی مثالیں ملتی ہیں عشق کے مصائب کی توجیہ اکثر نئے انداز سے کرتے ہیں اور یہیں ان کا تخیل کارفرما ہوتا ہے۔ ہمارے شعرا عشق کو دردسر بتاتے اور عشق میں دردسر کا رونا روتے چلے آئے ہیں لیکن اسکا سبب سب سے پہلے ملک الشعرا غزاؔل نے دریافت کیا ؎ الفت کا پہلا مرحلہ ہے کفش کاریاں ؛ ممکن نہیں کہ عشق ہو اور دردسر نہ ہو۔

کمر محبوب موجود ہے یا معدوم، ہمارے شعرا میں یہ مسئلہ متنازع فیہ رہا ہے لیکن غزاؔل نے برہان قاطع سے اس کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کردیا ؎

کمر نہیں ہے تو کیا کھوپڑی میں ہلکا لی　　　تمہاری ٹانگوں میں کیونکر آزار باقی ہے

ایک قصیدہ کے آخر میں ممدوح کو دعائے دوام دولت دیتے ہیں تو کس انداز سے :-

رہے سایہ سدا سر پر تمہارا کم نصیبوں کے　　　میاں غزاؔل کا لٹھ پھرتا رہے سر پر رقیبوں کے

مختصر یہ کہ گلہائے رنگارنگ اس گلدستہ کی زینت ہیں۔ دو لفظ مقامی شعرا کے متعلق سن لیجئے مقامی شعرا سے مراد وہ لوگ جو بجنور کے باشندے یا وہاں عارضی طور پر ساکن ہیں۔ انکی فہرست بہت طویل ہے، افسوس ہے کہ سب کو پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس فہرست میں بھی اصناف، طرز اور شعرا کے سن وسال کے اعتبار سے کافی تنوع ہے۔ ایک طرف جناب قدرت بجنوری، مشران الہ آبادی، نازؔ نجیب آبادی، شوقؔ بجنوری، عابد علی امروہوی اور غزاؔل جیسے کہنہ مشق شعرا ہیں تو دوسری طرف شمیم احمد جیسا صغیر سن شاعر۔ اور ان کے درمیان رعناؔ، اجملؔ، واحدؔ، قمرؔ، حامدؔ، شوقؔ وغیرہم ہیں۔

مشاعرہ ۹ بجے شروع ہوا اور صبح ۴ بجے ختم ہوا۔ صدارت سر سید رضا علی صاحب نے فرمائی۔ انکے برجستہ فقروں اور برمحل اور مخصوص تحسین نے مشاعرہ کی رونق کو دوبالا کر دیا۔ —— اس مشاعرہ کی دوسری خصوصیت اضافی ہے یعنی ادبی کانفرنس جو اسکے ساتھ مورخ و نقادِ ادب لالہ بابو صاحب سکسینہ رائے بہادر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انکی صدارت ہی اسکی کامیابی کا ضامن تھی، موصوف نے صدارت کے فرائض انجام دینے کے علاوہ اردو ادب کے جدید رجحانات پر ایک مقالہ پڑھا جو بیانہ ذوقِ ادب، سلامتیٔ طبع، توازن اور اعتدال رائے کا مظہر ہے۔ پروفیسر ضیا احمد صاحب نے اقبال کی تلمیحات پر ایک فاضلانہ مگر نامکمل مقالہ پڑھا۔ امید ہے کہ وہ اسے مکمل کر کے کتاب کی شکل میں شائع کر دینگے۔ ہمارے ادب میں یہ ایک نئی چیز ہوگی جسکی یقیناً ضرورت ہے۔ زکریا فیاضی صاحب ایک عرصہ سے پدماوت پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے انکی دسترس ہندی، انگریزی، اردو اور فارسی زبانوں اور ان کے ادب تک ہے۔ اس قسم کے لوگ ہمارے ادب کی کافی خدمت کر سکتے ہیں۔

سلطان الزماں صاحب کا مقالہ غزل کا نیا روپ، ہرچند مبسوط نہیں مگر فکر انگیز ضرور ہے۔ ملازمت کی مصروفیت کے باوجود مطالعہ کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ انکی کوشش بجائے خود قابلِ تحسین ہے۔ —— اختر الایمان صاحب سکریٹری حدیقۃ الشعر مسلم یونیورسٹی نے ترقی پسند ادب کے پرستار اور رکن کی حیثیت سے اسکی حمایت میں ایک پُرجوش لیکن پُرمغز تقریر کی جو افسوس ہے کہ سپردِ قلم نہ ہو سکی۔

آخر میں راقم اپنے مضمون "آتش پر ایک نظر" کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ یہ مضمون میں نے اپنے طور پر بغیر کسی نقاد کی رہنمائی کے آتش کو سمجھنے کی حقیر کوشش کی ہے۔ لہذا اسقام اور اغلاط ناگزیر ہیں جس کے لئے میں قارئین سے معذرت طلب ہوں۔ مضمون کے حجم کی ذمہ دار امثلہ ہیں۔ انکے پیش کرنے سے مقصد یہ تھا کہ آتش کے کلام کا ایک سرسری سا انتخاب بھی لگے ہاتھوں ہو جائے، مگر یہ مقصد خوفِ طوالت نے پورا نہ ہونے دیا۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے بکمالِ عنایت شرکت کا وعدہ کر لیا تھا مگر وقتی موانع کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ انھوں نے ہماری ادبی کانفرنس کے لئے ایک مقالہ بھی تیار کر لیا تھا جو بعد میں علیگڈھ کی مجلس میں پڑھا گیا —— حق کسی کا ملے کسی کو۔

یہ دونوں ادبی اجتماعات جنکی یادگار یہ گلدستہ ہے ہفتۂ جنگ بجنور کی آخری کڑی تھے۔ سید احمد علی صاحب خان بہادر جو کہ ضلع بجنور کے کلکٹر ہیں۔ ان مجلسوں کے محرک اور روحِ رواں ہیں۔ انکی علالت کے دوران میں شیخ اکرام الحق صاحب آئی سی ایس بحیثیت کلکٹر بجنور تشریف لائے اور انھوں نے ان مجلسوں کو حیات نو عطا کی۔ گلدستہ کی تدوین خان بہادر صاحب کے ذوقِ شعری کی ممنون ہے۔

مارچ میں مجھے بجنور چھوڑنا پڑا اور گلدستہ کی ترتیب کا سارا بار جناب خواجہ زکریا فیاضی صاحب کے سر پڑا —— میں انکا ممنون ہوں کہ انھوں نے بکمالِ فیاضی ان سطور کے لکھنے کی دعوت دی۔ دراصل گلدستہ کی تدوین میں میں کوئی حصہ نہ لے سکا۔ آخر میں میں اربابِ گلدستہ کی طرف سے ان شعرائے کرام اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی مطبوعات اور مقالے شائع کرنے کی ہمیں اجازت دی۔

سید حامد

All India Mushaira, Bijnor.

1st Row —Shamim Bijnori (who opened the Mushaira)

2nd Row—(From left to right) Prof. Zia Ahmad, Akhzar Malwi, Sabir Dehlvi, Wahshi Cawnpori, Rani Phool Kunwari Sahiba, R. B. Ram Babu Saxena, Jigar Muradabadi, Ehsan Danish, Hamid Siddiqi Lucknawi, Majrooh Sultanpuri.

3rd Row—Ajmal Najibabadi, Mr. Mushran, Mr. Z. Faiyazi Editor, K.S. Moulvi Abdus Sami, Mr. Akhtarul Iman, Raz Muradabadi, Mr. T.N Srivastava, Mr. Khurshidul Hasan Head Master, Rana Dehlvi.

4th Row— Pt. Brahma Sarup Clerk, Mr. S. Hamid Secretary, Mr. Abid Ali Khan, Nazar Amrohi, Abid Naqvi, Gh arran Bijnori, Shouq Bijnori, S. Sardar Ali. Mr Madan Gopal, Mr. Ahmad Husain, Mr. C B. Lal Clerk Mushaira, Nasiruddin.

طرحی کلام

قطعہ

مرے بختِ رسا نے بختِ خفتہ کو جگایا ہے ۔۔۔ مجھے خواب جوانی عہدِ طفلی میں دکھایا ہے
وطن کی چیدہ چیدہ ہستیاں شامل ہیں محفل میں ۔۔۔ شمیمؔ اُن کے لئے لیکر سلامِ شوق آیا ہے

غزل

(۱)

کُھل گئیں کیا آج زندانوں کی تقدیریں کہیں ۔۔۔ تیرے دیوانوں کو پہنائی ہیں زنجیریں کہیں
چپکے چپکے پھر رہے ہیں باغبانِ چمن ۔۔۔ پھانسنے کی ہو رہی ہیں میرے تدبیریں کہیں
اب تصور میں بھی آنا اُن کا مشکل ہو گیا ۔۔۔ ہو گئیں کیا بے اثر آہوں کی تاثیریں کہیں
اپنی صنعت پر مصوّر خود ہی حیراں رہ گیا ۔۔۔ بےخودی میں کھینچ بیٹھا ایسی تصویریں کہیں
بڑھ گئیں جوشِ جنوں میں اسقدر بیتابیاں ۔۔۔ توڑ ڈالیں تیرے مستانوں نے زنجیریں کہیں
میں ہوں، صحنِ باغ ہے، وہ ہیں بہارِ حسن ہو ۔۔۔ سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

اپنی قسمت کے لکھے پورے ہوئے آخر شمیمؔ
خامۂ قدرت کی مٹ سکتی ہیں تحریریں کہیں

شمیم بجنوری

(۲)

جہاں میں لطف و کرم آپ کا کہاں نہ ہوا ۔۔۔ بس ایک میں ہوں ستم رسیدہ جہاں نہ ہوا
ہزار بار گریں بجلیاں مصائب کی ۔۔۔ اسیرِ دامِ بلا مائلِ فغاں نہ ہوا

نظر وہ آئے تو کافور ہو گئے شکوے
علاجِ درد ہوا درد کا بیاں نہ ہوا

تمہارے حسن کے صدقہ طفیل میں جس کے
ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

ہزار بلایا نہ آئے، قسمت ہے
دلِ وفا زدہ اس پر بھی بدگماں نہ ہوا

ہوا نہ آپ کی گردن پہ ایک جہاں کا خون
بھلا ہوا مری آہوں کا امتحاں نہ ہوا

اگرچہ حسن نے اکثر لگائے نشتر ہیں
رگوں میں عشق کے خونِ وفا رواں نہ ہوا

مرے ہیں سر کو پٹک کر بڑے بڑے منشر آں
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا

منشر آں

---

(۳) ہزار حیف کہ دلِ آج شادماں نہ ہوا
جو وجہ رونقِ محفل تھا وہ یہاں نہ ہوا

کمالِ عشق میرا ہے جمالِ حسن یہ ہے
کہ دل میں آگ لگائی مگر دھواں نہ ہوا

مرا قصورِ نظر ہے تجھے نہ پہچانا
نہیں وہ کون سی محفل ہو تو جہاں نہ ہوا

وہ ایک حرفِ محبت پہ ہو گئے برہم
ہوئی یہ خیر میں سرگرمِ داستاں نہ ہوا

رقیب بیس قدم دور ہی کھڑا تکتا
میں آج محفلِ جاناں کا پاسباں نہ ہوا!

مجھے حقیر نہ سمجھو میں ہوتا پٹواری
مرا نصیب کہ اُس سال امتحاں نہ ہوا

شباب میں تو بٹھایا بتوں نے آنکھوں میں
ہوئے ضعیف تو کوئی قدرداں نہ ہوا

وہ بے نقاب نکلنے لگے ہیں اے غرّاں
بُرا نصیب ترا آج تو جواں نہ ہوا

غرّاں

قطعہ

خدا نے مدّتوں میں ہم کو ایسے دن دکھائے ہیں
کہ سب شعرائے ہندستاں یہاں تشریف لائے ہیں

خوشا آمد کہ محفل شوق ایسی جگمگاتی ہے
فلک سے آج گویا ماہ و انجم ٹوٹ آئے ہیں

غزل

(۴) خزاں میں اپنا نشیمن کہاں کہاں نہ ہوا
بہار آئی چمن میں تو آشیاں نہ ہوا

یہ بدنصیب کوئی مجھ سا بے زباں نہ ہوا
قفس میں رہ کے بھی جو مائلِ فغاں نہ ہوا

فراقِ یار میں ہم کس سے حالِ غم کہتے
دل اُن کا ہو گیا پر میرا رازداں نہ ہوا

صدف میں رہ کے بنا گو یا گوہرِ یکتا
وہی جو قطرۂ خوں آنکھ سے رواں نہ ہوا

سنایا داورِ محشر کو لاکھ بار مگر
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا

تمہارے وعدوں پہ کس دن نہ اعتبار آیا
ہمارے صبر کا کس روز امتحاں نہ ہوا

جلایا آتشِ فرقت نے اس طرح ہم کو
کہ منہ سے آہ تو نکلی مگر دھواں نہ ہوا

چلی اُدھر کو جدھر اس کو لے چلیں موجیں
ترے ہی شوق کی کشتی میں بادباں نہ ہوا

شوق بجنوری

(۵)

مجھے تو پاسِ ادب تھا جو کچھ بیاں نہ ہوا
مگر جنوں بھی مرے دل کا ترجماں نہ ہوا

پھر اور کیا ہے دمِ ہستی جو رائیگاں نہ ہوا
عطا مجھے غمِ ہستی بھی جاوداں نہ ہوا

بتا! تجھے مرے ہر زخمِ آرزو کی قسم
مرا لہو دمِ ارماں کہاں کہاں نہ ہوا

دکھا سکا نہ زمانہ مجھے زمانے میں
وہ ایک دل جو زمانہ سے بدگماں نہ ہوا

دیئے حیات نے یوں طفلِ آرزو لاکھوں
مرا نصیب! مگر ایک بھی جواں نہ ہوا

مرے حبیب! چمن زارِ بزمِ ہستی میں
کوئی خیال بھی وجہِ سکونِ جاں نہ ہوا

اُلٹ دیا مری وحشت نے وہ نقاب مگر
جنوں ہی چارہ گرِ مرگِ ناگہاں نہ ہوا

تری تلاش میں کب سے ہے کاروانِ حیات
مرے کریم ترا دل بھی مہرباں نہ ہوا

جہان مرکزِ انوار تھا مگر اے تجلّی
مرے بغیر منوّر یہ خاکداں نہ ہوا

انجم نجیب آبادی

(۶)

حضورِ حسن غمِ ضبط رائیگاں نہ ہوا
وہ پوچھتے ہی رہے حالِ دل بیاں نہ ہوا

حیاتِ عشق تصدق نگاہِ جاناں پر
ہزار تیر لگے دل پہ اور نشاں نہ ہوا

سجودِ زاہد و کعبہ میں ربط ہو کیونکر
مری جبیں نہ ہوئی تیرا آستاں نہ ہوا

کلیم ہو گئے بے ہوش طور خاکستر
تجلّیوں کا کوئی ناظراں نہ ہوا

شعری بھوپالی

(۷)
کوئی خودی سے خدا بنکے کامراں نہ ہوا
حُباب اُبھر کے کبھی بحرِ بیکراں نہ ہوا

مژہ پہ پاس سوا اک اشک بھی عیاں نہ ہوا
کوئی ستارہ شبِ غم میں ضوفشاں نہ ہوا

رہینِ منت فریاد و نالہ کیا ہوتا
وہ رازِ غم کہ جو شرمندۂ بیاں نہ ہوا

مجھے تو بہرِ سکوں عالمِ محبت میں
کوئی زمیں نہ ملی جس پہ آسماں نہ ہوا

کہاں سے غم کے لئے روز اک جگر لاتے
قیامِ عمر غنیمت ہے جاوداں نہ ہوا

وہی پلٹ کے بنا دل میں آتشِ سیال
ٹپک کے آنکھ سے جو اشک رائیگاں نہ ہوا

ترے خیالِ مسلسل سے اب یہ تسکیں ہے
کہ دیکھے سر ترا سودا مجھے گراں نہ ہوا

وجودِ دل ہی تھا شاید حجابِ دیدۂ دل
پھر اس کے بعد کوئی پردہ درمیاں نہ ہوا

نہ جانے کس کا یہ جلوہ ہے بزمِ ہستی میں
کہ لاکھ پردۂ رنگیں میں بھی نہاں نہ ہوا

یہی ہے گرمیٔ گفتارِ طور کا حاصل
کہ عشقِ حُسنِ ازل کا مزاج داں نہ ہوا

سوائے خار کے اس گلستانِ ہستی میں
کوئی بھی وحشیٔ خستہ پہ مہرباں نہ ہوا

وحشی کانپوری

(۸)
قبول ایک بھی سجدہ، مرا یہاں نہ ہوا
حریمِ عرش ہوا تیرا آستاں نہ ہوا

وہ ایک قطرۂ خوں آبروئے دامن ہے
جو اشک بن کے گرا اور رائیگاں نہ ہوا

زمیں کی گود میں مٹّی مری امانت ہے
میں رائیگاں بھی ہوا اور رائیگاں نہ ہوا

ہوس کدوں میں دیئے حسن کو ہوس نے فریب
نظر کے ساتھ کہیں دل کا امتحاں نہ ہوا

نہ خُلد اپنا ٹھکانہ، نہ مستقرِ دُنیا
ہماری طرح کوئی بھی رواں دواں نہ ہوا

بجا ہے خود مری ہستی تھی اک تباہ دماں
ہزار شکر کہ میں زیبِ داستاں نہ ہوا

دبی دبائی سی اک راکھ تھا دلِ سوزاں
تمام عمر جلا ایک دن دھواں نہ ہوا

صدا وہ ہے کہ جو دل سے نکل کے دل ڈھونڈے
وہ نغمہ کیا ہے جو مضرابِ سازِ جاں نہ ہوا

فتادگی میں مری تھی شگفتِ فطرت کی
کہ میں مزاجِ چمن پر کبھی گراں نہ ہوا

فنا کا مقصدِ تخریب ہو گیا پورا
اور ایک ذرّۂ ہستی بھی رائیگاں نہ ہوا

کرے گا رازِ حقیقت کا کس طرح ادراک
یہ آدمی کہ جو اپنا بھی رازداں نہ ہوا

مری رَجَزِ لئے ارادوں میں بجلیاں بھر دیں
سُبک خرام کبھی میرا کارواں نہ ہوا

قفس کی تنگ دلی کا ہو اُس کو کیا احساس
جسے نصیب کبھی عیشِ آشیاں نہ ہوا

نظامِ عالمِ ہستی میں کوئی عیب نہیں
ذرا سا نقص یہی ہے کہ جاوداں نہ ہوا

رفیقِ راہ رہا حسنِ چارسو سیماب
بچھڑے ہوئے منزل، سفر گراں نہ ہوا

سیماب اکبرآبادی

غیر طرحی کلام

زمزمۂ حمد

تو ہی بھروسا تو ہی سہارا
پروردگارا! پروردگارا!

یوں میں نے جیتی اُلفت کی بازی
اک بار کھیلا سو بار ہارا

منظور منظور اے اہلِ دنیا
اللہ میرا باقی تمہارا

حاضر ہوں میں بھی حاضر ہے دل بھی
دل بھی تمہارا ہیں بھی تمہارا

یہ نا خدا ہے اے اہلِ کشتی
شاید کسی وقت کرے کنارا

سیراب کرتے دنیا میں ساقی
عقبیٰ کی تلخی مجھ کو گوارا

آنکھوں میں آنسو، لب پر تبسّم
اپنا تصوّر اپنا نظارا

جینا پڑے گا ایمانِ شیریں
کرنا پڑے گی تلخی گوارا

عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی
وہ بھی یہ پالے میں بھی نہ ہارا

پھر یہ جہنم کس کے لئے ہے؟
آمرزگارا! آمرزگارا!

حفیظ جالندھری

جوانی

چڑھتے ہوئے دریا کی روانی ہے "جوانی" — یا کوہ سے ڈھلتا ہوا پانی ہے "جوانی"
قدموں میں ہے محشر تو نگاہوں میں ہے فردوس — سچ کہتی ہے دنیا کہ "دوانی ہے جوانی"

آج کی رات

جلوہ فرما ہے کوئی دشمن دیں آج کی رات — میرا غم خانہ ہے فردوس بریں آج کی رات
زہرہ آواز و ثریا رخ و کوثر چشمے — خلوت شوق میں ہے کوئی حسیں آج کی رات
ماہ دو ہفتہ کی ضیا پاشی و تابش کی قسم — ماہ دو ہفتہ ہیں یہ ذرات زمیں آج کی رات
ہمہ نغمہ، ہمہ مستی، ہمہ خوشبو، ہمہ رنگ — جیسے آغوش میں ہے خلد بریں آج کی رات
اے خوشا مستی و سرمستی و بدمستی شوق — اپنی ہستی کا بھی احساس نہیں آج کی رات
میرا کیا ذکر کہ ہوں صرف نظر، وقف جمال — انتہا یہ ہے انہیں ہوش نہیں آج کی رات

کفر ہے کفر جو اے رازؔ نہ اب آئے یقیں
وہ دلاتی ہیں محبت کا یقیں آج کی رات

رازؔ مراد آبادی

شکستہ رباب کا عالم

حسن کافر شباب کا عالم — سر سے پا تک شراب کا عالم
عرق آلود چہرۂ تاباں — شبنم و آفتاب کا عالم
وہ مری عرض شوق بیجا پہ — کچھ حیا کچھ عتاب کا عالم

زانوئے شوق پر وہ پچھلے پہر — نرگس نیم خواب کا عالم
دیر تک اختلاطِ راز و نیاز — یک بیک اجتناب کا عالم
لاکھ رنگیں بیانیوں پہ مری — اک سادہ جواب کا عالم
غم کی ہر موج، موج طوفاں خیز — دل کا عالم حباب کا عالم
دلِ مطرب سمجھ سکے شاید — اک شکستہ رباب کا عالم

وہ سماں آج بھی یاد ہے جگرؔ
ہاں مگر جیسے خواب کا عالم

جگر مرادآبادی

اے گوشہ نشیں..... اُٹھ!

کون کہتا ہے فضائے لامکاں کی سیر کر — تو جہاں پیدا ہوا ہے اُس جہاں کی سیر کر
تیری ہی دنیا کے حصے ہیں زمین و آسماں — حدِّ ممکن تک زمین و آسماں کی سیر کر
تیرے طیارے خلاؤں میں خراماں ہیں تو کیا — اور اوپر جا — جہانِ کہکشاں کی سیر کر
ہیں زمیں کی وسعتیں بھی تیرے قدموں کے لئے — مشرق و مغرب کے ہر جلوہ ستاں کی سیر کر
روند ڈال اپنے قدم سے کیا جنوب اور کیا شمال — ہر طرف، ہر سمت، ہر جانب یہاں کی سیر کر
دیکھ سطحِ آب پر سیلاب و طوفاں کا نشان — تہہ میں جا کر باطنِ آبِ رواں کی سیر کر
عالمِ ہستی کے طے کر سب نشیب اور سب فراز — وادی و کہسار و دشت و گلستاں کی سیر کر
قصر و ایواں کی طرح زنداں بھی ہیں شایانِ دید — ہر قفس کی سیر کر، ہر آشیاں کی سیر کر
کائنات دلکش دیر و کلیسا میں گذر — باقیاتِ عظمت اسلامیاں کی سیر کر
ہے یہ دنیا بہرِ انساں اک متاعِ بیکراں — حوصلوں سے اس متاعِ بیکراں کی سیر کر
خلد اک رنگیں تصور ہے مجسم ہو نہ ہو — زندگی میں اس بہشتِ جاوداں کی سیر کر
خاک کے پتلے تجھے آنا نہیں ہے پھر یہاں — سیر ہو کر جلوہ زارِ خاکداں کی سیر کر
جستہ جستہ تجھ پہ کھل جائیں گے اسرارِ حیات — صفحہ صفحہ سیرتِ افکارِ جواں کی سیر کر

تصوّر

آج بھی اُن کی محبّت کا تصوّر یہ ہے
آج بھی کوئی مجھے دادِ وفا دیتا ہے

دم سا گھٹتا ہو اگر غم کی سیاہ راتوں میں
شمع کی لو کوئی چپکے سے بڑھا دیتا ہے

اب بھی جب پیاز اٹھاتا ہو مرا دستِ جنوں
کوئی ٹوٹے ہوئے تاروں کو ملا دیتا ہے

اب بھی جس وقت چھلک اٹھتی ہیں آنکھیں میری
اپنا آنچل کوئی چپکے سے بڑھا دیتا ہے

میں تو اب عہدِ وفا اور سے کر لوں لیکن
کوئی دھیرے سے مرا ہاتھ دبا دیتا ہے

اب بھی اٹھتی ہیں مری سمت وہ نظریں ایسے
جیسے سب کچھ کوئی خوشی کو لٹا دیتا ہے

ہائے یہ گرم و دلآویز تصور اُن کا
کوئی پھر دل میں مرے آگ لگا دیتا ہے

اور پیتا ہوں تو پینے نہیں دیتا کوئی
اب کسی طرح بھی جینے نہیں دیتا کوئی

جاں نثار اختر

جنوں کے دور میں ایسی بھی اک گھڑی آئی
کہ اپنے حال پہ بیساختہ ہنسی آئی

چلا جو کوچۂ جاناں کی سمت میں نخشب
تو دور تک مجھے سمجھانے زندگی آئی

رازِ اُلفت

کوئی کس طرح رازِ الفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

وہ مجبوریوں پر مری مسکرائے
یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

محبت میں کچھ اتفاقات بھی ہیں
کہ جو میری تقدیر بننے نہ پائے

وہ اس طرح میرے برابر سے گذرے
ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے

میں اس احتیاطِ نظر کے تصدق
نہ بیگانہ سمجھے نہ اپنا بنائے

ترے روبرو گر نظر مطمئن ہو
تو سینہ میں بھی دل دھڑکنے نہ پائے

ترا غم بھلا کیا چھپائے سے چھپتا
بہت اشک روکے بہت مسکرائے

Sir Syed Raza Ali,
President, All India Mushaira, Bijnor

یہی تو جواب شکایت تھا نخشب
مرے شعر اُس نے مجھی کو سنائے

رباعی

جلوے نگاہ شوق سے ٹکرا کے رہ گئے — یوں سامنے وہ آئے کہ شرما کے رہ گئے
دل کا ہجوم یاس میں عالم نہ پوچھئے — کیا کیا خیال ذہن میں آ کے رہ گئے

نخشب جارچوی

قطعہ

باتیں تو کئی قابل تعریف ہیں لیکن — ہے بزم فن آل انڈیا بجنوری بات
اکرام حق احمد علی کا نازہے اعجاز — لوٹ آئی گئے گذرے زمانہ ہیں گئی بات

غزل

حقیقت کیا ہے جو انساں سے پہچانی نہیں جاتی — مگر ہاں کنہ حق تک فکر انسانی نہیں جاتی
ٹھہرتا ہے جو دل اشکوں کی طغیانی نہیں جاتی — قیامت ہے کہ غم کی حشر سامانی نہیں جاتی
نہ جانے انکو کن آنکھوں سے کس عالم میں دیکھا تھا — نگاہ شوق سے جلووں کی حیرانی نہیں جاتی
خزاں نے ہائے کیا چھوڑا چمن میں ننگ وحشت کا — بہاروں میں بھی گل کی چاک دامانی نہیں جاتی
چھپائے ابر کے ضو مہر کی جیسے نہیں چھپتی — پس چلمن بھی اُن کی جلوہ سامانی نہیں جاتی
نہ جانے آپ سے باہر کیا یہ کس کے جلووں نے — گئیں عمریں اور آئینہ کی عریانی نہیں جاتی
مٹا دیگا بقا کو میری کیا دست فنا جس سے — مٹائی اک مری تحریر پیشانی نہیں جاتی
نہیں ہمت کو کچھ مشکل جہاں میں ہاں یہ مشکل ہے — تن آسانوں کی تن آسانی آسانی نہیں جاتی

خدا اپنی کہاں اور تو کہاں اے نازؔ توبہ کر
حقیقت تجھ سے اپنی آپ پہچانی نہیں جاتی

نازؔ نجیب آبادی

حُسن بالائے بام ہوتا ہے — رازِ دل آج عام ہوتا ہے
مری دنیائے دل اُلٹ دیجیے — آپ کا اس میں نام ہوتا ہے
خود ہی پروانے جان دیں لیکن — شمعِ محفل کا نام ہوتا ہے
دامنِ ضبط چھوٹ جائے جہاں — ایک وہ بھی مقام ہوتا ہے
گر ہی جاتا ہے دستِ مژگاں سے — جبکہ لبریز جام ہوتا ہے
کائناتِ خیال میں اُن کا — مختصر سا قیام ہوتا ہے
دردِ اُٹھا، کبھی تو دل بیٹھا — دن اسی میں تمام ہوتا ہے
شبِ ہجراں کی سختیاں معلوم — آنکھ لگنا حرام ہوتا ہے
نگہِ فتنہ زا کی شوخی سے — آج برہم نظام ہوتا ہے
دل سکوں آشنا نہیں ورنہ — رازِ ہستی تمام ہوتا ہے

ہو کے آگاہ رازِ بت خانہ
آج عابدؔ بھی رام ہوتا ہے

عابدؔ امروہوی

فرہاد سے جو کام لیا ہے کبھی کبھی — اُس نے بھی دل کو تھام لیا ہے کبھی کبھی
کیا کیا ہوا ہے دورِ محبت میں کچھ نہ پوچھ — دل سے بھی انتقام لیا ہے کبھی کبھی
جو نام دل میں رازِ محبت بنا رہا — بے ساختہ وہ نام لیا ہے کبھی کبھی
اُن پر اثر ہوا نہ ہوا اس کو کیا کریں — انھوں نے عرش تھام لیا ہے کبھی کبھی
ایک تم ہی مستحق نہیں جنت کے زاہدو! — ہم نے بھی اس کا نام لیا ہے کبھی کبھی

اخضرؔ نگاہِ ناز میں یہ بھی ہے اک فسوں
گرتے ہوئے کو تھام لیا ہے کبھی کبھی

اخضرؔ مالوی

بے پردہ تری محفل میں تجھے ہم دیکھتے یہ مقدور نہ تھا — دل خود ہی تماشا بنتا تا دل کو یہ کبھی منظور نہ تھا
ہاں فصلِ گل آئی اور گئی ہم جانتے کیوں خاموش رہو — کچھ دستِ جنوں کی دامن اور دامن کی گریباں دور نہ تھا

ہم شوق کو کیوں ناکام کہیں یہ بھی تو ہمیں معلوم نہیں
کچھ پاس ادب سے لب نہ ہلے یا شکوۂ غم منظور نہ تھا

وہ سامنے تھے نظروں کے مگر اک پردۂ حیرت حائل تھا
محسوس یہ ہوتا تھا جیسے میں دور ہوں لیکن دور نہ تھا

معلوم ہوا اب مجھ کو نظرؔ احساسِ شکستِ دل بھی نہیں
ہر ایک نگاہِ لطف پہ رونا تیرا تو دستور نہ تھا

نظرؔ امروہوی

رسمِ شکستِ توبہ کو سامنے لا کے پی گیا
اُس نے کہا کہ "پی" تو میں جوش میں آ کے پی گیا

تلخیٔ روزگار کو دل سے بُھلا کے پی گیا
ساقیٔ مست چشم سے آنکھ ملا کے پی گیا

میں نہ فقط شرابِ عشق کیف میں آ کے پی گیا
زہرِ غمِ حیات بھی ساتھ ملا کے پی گیا

ناصحِ بے خبر نہ پوچھ گرمیٔ ذوقِ مے کشی
رحمتِ حق کو بارہا جوش میں لا کے پی گیا

کوئی الم نہ کوئی غم اب کچھ نہ خیالِ بیش و کم
جتنی ملی، جہاں ملی ہنس کے ہنسا کے پی گیا

میکدۂ بہار میں جب تری یاد آ گئی
بے خبر و بغیرِ عزم جام اُٹھا کے پی گیا

حضرتِ خضر بھی جہاں راہبری نہ کر سکیں
ہوش و خرد کو ایسی اک راہ دکھا کے پی گیا

پھر بھی تری نگاہ میں جو ہے وہ کیفیت کہاں
یوں تو ہزار جامِ مے منہ سے لگا کے پی گیا

نجمیؔ زار تھا مجھے حشر کا خوف بھی مگر
رحمتِ بے پناہ کی آس لگا کے پی گیا

نجمیؔ احسانی نگینوی

محبت

نام شاید اسی کا ہو اُلفت
جب کسی کام کا خیال کیا

وہ اسے کس نظر سے دیکھیں گے
دل نے پہلے ہی یہ سوال کیا

یادِ ایام

جس طرح جھٹ پٹے کی گھڑیوں میں
چھوٹتی ہوں جہاں کی نبضیں

اور دن کا شباب ڈھلتا ہو اور بھرتی ہو زندگی آہیں

دِل میں اک آرزو سی رہتی ہے

دِل کو اک جستجو سی رہتی ہے

میں سکوں کے لیئے مچلتا ہوں مضطرب ہوں مگر سنبھلتا ہوں

حال میرے لیئے ہے بے معنیٰ مثلِ شمع مزار جلتا ہوں

دِل میں اک آرزو سی رہتی ہے

دل میں اک جستجو سی رہتی ہے

نزع میں ہے حیات کی حسرت شیب میں ہے شباب کی اُلفت

یاد آئے شباب میں طفلی یاد ایام بن گئی فطرت

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے

دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

کیا ہوئے دوستوں کے وہ جمگھٹ لی زمانے نے یک بیک کروٹ

اب تلک ہے نگاہ آوارہ کان بھولے نہیں ہیں وہ آہٹ

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے

دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

جھلملاتے فلک پہ ہیں اختر اور بیتے ہوا کے دامن پر

ہیں اُلٹتا ورق ہوں ماضی کے پہ نظر ٹھہرتی نہیں دم بھر

دِل میں اک آرزو سی رہتی ہے

دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

رات ہو ابر گھر کے چھایا ہو ہر طرف تیرگی کا سایہ ہو

اس میں بجلی کہیں چمک جائے مجھ کو ماضی نہ یاد آیا ہو

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے

دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

کیا تغیّر ہے بنائے جہاں؟ کیوں بدلتا ہے ہر گھڑی انساں؟
کیوں ہے آخر قرار نا ممکن؟ درد کا میرے کیا نہیں درماں؟

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

زندگی کیا ہے پردۂ سیمیں جس پہ اشکال کو قرار نہیں
ہیں تصاویر بے شمار حسیں ایک سمجھی ہے چشم ظاہر بیں

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

آہ پھر دیکھ بھی نہیں سکتے جو سماں ایک بار دیکھ چکے
راحت ایک لمحہ اور خلش دائم کیا یہی زندگی کا حاصل ہے؟

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

وا ہمہ ہے حیات کہتے ہیں ہے تغیّر ثبات کہتے ہیں
ٹھہرنے کا جہاں مقام نہیں اس کو ہم کائنات کہتے ہیں

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

میری دنیا تصوّرات سے ہے خود تصوّر توہّمات سے ہے
عکس کے عکس کی حقیقت کیا؟ یہ تعلق مجھے حیات سے ہے

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

یہ تصوّر بلائے جاں ہے مجھے سود سمجھا تھا میں زیاں ہے مجھے
اس کی فتنہ زنی معاذاللہ ہر نفس ایک داستاں ہے مجھے

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

یا تصوّر بہت قوی ہوتا یعنی ہر خوف سے بری ہوتا
دور رکھتا حقیقتوں سے مجھے یا نہ ہوتا جو عارضی ہوتا

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل میں اک جستجو سی رہتی ہے

راس آتی نہیں خوشی مجھ کو خوف ہے یاد آنے کی مجھ کو
یادِ ماضی و خوفِ مستقبل ہے یہی آہ زندگی مجھ کو

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل میں اک جستجو سی رہتی ہے

خواب دلکش تھا خواب مبہم تھا رات دل کا عجیب عالم تھا
صبح دھندلی سی یاد باقی تھی رنگ پھیکا تھا نقش مدھم تھا

دل میں اک آرزو سی رہتی ہے
دل کو اک جستجو سی رہتی ہے

سیّد حامد

رباعیات

(۱)
سرخی قصۂ غم خونِ تمنّا دیکھا دوشِ ہر چشم پہ آنسو کا جنازہ دیکھا
نبض پہ ہاتھ نظر سوئے فلک مہر بلب چارہ گر چپ تو ہے کچھ تو بتا کیا دیکھا؟

---

(۲)
نہایت رنگا رنگ نہیں ملتی طبیعت فلک نکتہ چیں نہیں ملتی
تھا جن کا نقش کفِ پا خراجِ ہفت اقلیم اب ان کے دفن کو گز بھر زمیں نہیں ملتی

فیض جھنجھانوی

---

(۱)
دیکھو دیکھو حیاتِ فانی دیکھو دریا میں حباب کی روانی دیکھو
او نام پہ زندگی کے مرنے والو سر سے وہ گذر رہا ہے پانی دیکھو

(۲) سودا یہ پکارتا ہے سر سے سر دے — پیمانہ کی ہے صدا کہ بھر دے بھر دے
میخانہ یہ کہہ رہا ہے تجھ سے ساقی — ہر قطرۂ بینوا کو دریا کر دے

---

(۳) افسردہ کلی کا بھی سمجھتے کھلنا معلوم — بے حس ہو کر بھی دل کا ہلنا معلوم
میں خوب سمجھ رہا ہوں دنیا تجھ کو — تو مل گئی جب، خدا کا ملنا معلوم

---

(۴) جو حسن میں جا کے ناز بنجاتا ہے — اور عشق میں جو نیاز بنجاتا ہے
جو نغموں میں جا کے ساز بنجاتا ہے — دل میں مرے آکے ساز بنجاتا ہے

---

(۵) جب گلشن دہر میں تھا مسکن میرا — پھولوں سے بھرا ہوا تھا دامن میرا
اب بعد فنا سبک ہوں اتنا وحشیؔ — نکہت میں گلوں کے ہے نشیمن میرا

وحشیؔ کانپوری

مدعائے عشق

وفا سے بیزار ہو چکا ہوں کہ احترام وفا نہیں ہے — اس آئینہ کو شکست کر دو یہ آئینہ آئینہ نہیں ہے
بساط گردوں پہ ماہ و انجم زمیں کے دامن میں لالہ و گل — تجلیاں سی تجلیاں ہیں کہ ہوش عالم بجا نہیں ہے
یہ روز تجدید عہد الفت، یہ روز پیمان دلنوازی — ہزار تسلیم کر رہا ہوں مگر یقین وفا نہیں ہے
مری محبت عقیدتوں میں پرستشوں کی حد تک گذری — مگر وہ یوں بے نیاز مجھ سے کہ جیسے میرا خدا نہیں ہے
مرے مصائب تو ہر نفس پر ترے کرم ہی سے مطمئن ہیں — وہ لوگ کس طرح جی رہے ہیں جنھیں ترا آسرا نہیں ہے
ہزار نامہرباں سہی تو، میں ایسا محسوس کر رہا ہوں — تمام دنیا میں جیسے کوئی ترے سوا آسرا نہیں ہے
بجا بجا بے شمار عارض نظر نظر کو ترس رہے ہیں — مگر یہ دل کا معاملہ ہے نگاہ کا واسطا نہیں ہے
ہر اک بلندی کا بار پستی لئے ہوئے دوش پر کھڑی ہے — گذرنے والے گذر رہے ہیں مگر کوئی دیکھتا نہیں ہے
حسین چہروں کی آڑ لیکر جنوں کو آواز دینے والے — نگاہ سے ماورا سہی تو شعور سے ماورا نہیں ہے

تڑپ سکے جسقدر تڑپے مگر ذرا یہ خیال رکھنا
کہ تیرا جو مدّعا ہے اے دل وہ عشق کا مدّعا نہیں ہے

احسان بن دانش

مخاطب وہ ہوئے کچھ اس طرح اکثر مرے دل سے
کوئی جیسے پکارے ڈوبنے والے کو ساحل سے

اتحادِ باہمی

دیدۂ و دل ہیں کہ جام بادۂ سرجوش ہیں
خندۂ لالہ و گل ہیں کہ تسکین دل غم کوش ہیں

جا بجا پہلو بہ پہلو صرف ناؤ نوش ہیں
الغرض اپنے ہوں یا بیگانے ہم آغوش ہیں

تا بکے شیخ و برہمن میں رہے گا اختلاف
ہموطن ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے انحراف

ہم تمہارے ہوں مخالف تم ہمارے ہو خلاف
کیا پنپنے کی یہی باتیں ہیں گستاخی معاف

کیوں نہ تفریق این و آں سے ہم آغوش ہوں
مرنا جینا ایک جگہ ٹھہرا تو ہم آغوش ہوں

مختلف ہوں لاکھ وجہ رزق محفل ہے ایک
سیکڑوں محل ہیں لیکن لیلئے محمل ہے ایک

سچ اگر پوچھو تو بنیادِ حق و باطل ہے ایک
راستے ہیں مختلف مانا مگر منزل ہے ایک

ماسوائے مشرب اُلفت کوئی مشرب نہیں
جو سکھائے دشمنی آدم کو وہ مذہب نہیں

ٹکڑے ٹکڑے کر دیں مل جل کر ہر اک زنجیر کو
نذر دورِ عیش کر دیں گردش تقدیر کو

نغمۂ عشرت فزا دیں نالۂ شبگیر کو
صبح کا آئینہ بخشیں شام کی تصویر کو

جذب محکم سے طلسم کمتری توڑ دیں
غیر کیا شے ہے مقدر کی کلائی موڑ دیں

اسمٰعیل تمنا جھنجھانوری

غزل

یہ رنگ شفق یہ خون سحر یہ مہر کا جلوا کیا دیکھیں
آغاز تمنا دیکھ لیا انجام تمنا کیا دیکھیں

پھولوں سے ڈھلکتی یہ شبنم یہ شام کے لب پر نغمۂ غم
یہ سب اپنا ہی تماشا ہے اپنا ہی تماشا کیا دیکھیں

جلسے کہ اُٹھا تو پھرتا ہے خاموش فضاؤں میں کوئی
اب تیرے تصور کے آگے ہم اوج ثریا کیا دیکھیں

انگشت بدنداں ہو کوئی یا آگ لگی ہو محفل میں
وہ اُن کی نظر پہ اپنا جنوں اپنے ہم کا نقشہ کیا دیکھیں

اے ساقیٔ رنگیں کیا کہنا کیا چیز اُٹھائی شیشے میں
عقبیٰ کی فضائیں روشن ہیں دنیا کا اُجالا کیا دیکھیں

سینوں میں تلاطم اُٹھنے دو جلووں کو خراماں رہنے دو
جب اپنی ہی حالت ہو گئی پھر حالت دنیا کیا دیکھیں

مجروح امیدوں کو اب تو رہ رہ کے پسینہ آتا ہے
بیمار کی حالت دیکھ چکے اعجاز مسیحا کیا دیکھیں

مجروح سلطانپوری

غزل

خبر نہیں کچھ تری خدائی کہاں نہ تھی کون و مکاں کے پہلے
مگر ہماری خودی کا چرچا جو اب تھا بزم جہاں کے پہلے

بکھیرے دلوں کے سکوت لیکن اسی دھندلکے میں جان ڈالی
وہ ہم تھے جس نے جہاں بنایا مصورِ نیم جاں کے پہلے

ہمارے ہونٹوں کی تشنگی سے مہک رہی ہے تمام محفل
اور اس پہ اک بد حواس ساقی پوچھتا ہے کہاں کے پہلے

جہاں تھا شعلۂ تغیر مری عقیدت کو پھونک دیتا
مگر وہ نازک مزاج بجلی ٹھہر گئی آشیاں کے پہلے

ہر اک طرف اک ہوا تھی ہوا سے نقوشِ منزل اُڑے اُڑے سے
غریب دل کو یہ کشمکش ہے قدم اُٹھائے کہاں کے پہلے

کسے شکایت تھی آندھیوں سے کہ سہارا تھا رہبر کا
دلوں میں نور امید لیکر پہنچ گئے کارواں کے پہلے

کسی کلی سے لہو ٹپکنا مرا کوئی امتحاں تھا شاید
مری پرستش کے ماہ و انجم بکھر گئے آسماں سے پہلے

بیچین

غزل

لطیف پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے
محبت آئینہ ہو چکی تھی وجود بزم جہاں سے پہلے

نہ وہ مہر کے دل سے باخبر تھے نہ اُن کو احساسِ آرزو تھا
مگر نظام وفا تھا قائم کشود راز جہاں سے پہلے

ہر ایک عنوان درد فرقت ہے ابتدا کو شرح مدعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں اُنکو کہاں سے پہلے

مسرتیں پا زدا غم تھیں مسرتوں میں الم تھا پنہاں
کبھی صحن چمن میں شاید بہار آئی خزاں سے پہلے

اٹھا جو مینا بدست ساقی، رہی نہ کچھ تاب ضبط باقی
تمام میکش پکار اُٹھے یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے!

قسم فریب نگاہ و دل کی ہیں تو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی در اصل اپنی منزل قدم اُٹھا تھا جہاں سے پہلے

ازل سے تا پا لکھی ہوئے تھے شکیل قسمت میں جور پیہم
کھلی جو آنکھیں اس انجمن میں نظر ملی آسماں سے پہلے

شکیل بدایونی

تجلیات

مقاماتِ اربابِ جاں اور بھی ہیں
مکاں اور بھی لامکاں اور بھی ہیں

مکمل نہیں ہے جنونِ تجسس
مسلسل جہاں در جہاں اور بھی ہیں

نہیں منحصر کچھ حرم و بتکدہ تک
مری تشنہ ساما نیاں اور بھی ہیں

یہیں تک نہیں عشق کی سیرگاہیں
مہ و انجم و کہکشاں اور بھی ہیں

خوشا درسِ غیرت نہ ہے عشق تنہا
وہاں میں نہیں ہوں جہاں اور بھی ہیں

صبا خاکِ دل سے بچا اپنا دامن
ابھی اس میں چنگاریاں اور بھی ہیں

قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بلبل
قفس صورت آشیاں اور بھی ہیں

انہیں جب سنے ہے اعتقادِ محبت
تو مجھ سے جگر بیگماں اور بھی ہیں

جگر مرادآبادی

امواجِ تبسم

اُس لب پہ تبسم کی موجیں موجوں کا تبسم کیا کہئے
بے لفظ و بیاں بے ساز و صدا انداز ترنم کیا کہئے

اللہ رے یہ گلگشتِ چمن جس سمت نظر اٹھ جاتی ہے
کلیاں سی چٹکنے لگتی ہیں اعجاز تکلم کیا کہئے

اُف جوش و خروش کا وہ عالم کونین لرزنے لگتے ہیں
جب حسن و عشق میں ہوتا ہے ناگاہ تصادم کیا کہئے

خود جذبۂ عشق نے پہنچایا اک حسن کی ایسی منزل تک
کچھ نغمے تھے جن میں اپنی آواز ہوئی گم کیا کہئے

بیگانۂ شوق ہوئی اکثر ہر چیز سے اپنی فکر و نظر
یوں دیدہ و دل پر چھائے ہو جیسے ہو تمہیں تم کیا کہئے

وہ اٹھتے ہی پردہ پہلے پہل اک عالمِ حیرت دونوں طرف
نظروں میں تصادم ہوتے ہی جلووں کا تلاطم کیا کہئے

مستِ مئے عرفاں کہیئے اُسے یا رندِ خراباتی تشنہ حمید
جو خاکِ درِ میخانہ سے کرتا ہو تیمم کیا کہئے

حمید صدیقی لکھنوی

دِل ہے برائے نام اب دل ہیں شگفتگی نہیں
گل ہے مگر مہک نہیں شمع ہے روشنی نہیں

سر ہے اختیار میں سجدہ وہ سجدہ ہی نہیں
بندگی اور بقید ہوش کھیل ہے بندگی نہیں

موسم رنگ کیف کی اب وہ ہما ہمی نہیں
سبزہ و ابر ہیں سبھی ایک فقط وہی نہیں

عاشقی اور بقید شوق کفر ہے عاشقی نہیں
اس کی خوشی پہ جان دے تیری خوشی خوشی نہیں

جس میں برائے کیفیت رنج کی چاشنی نہیں
ایسی خوشی کا ذکر کیا ایسی خوشی خوشی نہیں

حسن کا دیکھ دل نہ توڑ، ضبط کو ضبط کر کے چھوڑ
زہر ملے تو منہ نہ موڑ عشق ہے یہ ہنسی نہیں

واعظ سادہ لوح کی ہائے رے چیرہ دستیاں
مے کو بتا رہا ہے تلخ ظلم یہ ہے کہ پی نہیں

اس کی نظر ملی تو کیا، اسکی نظر پھری تو کیا
جس میں ہو یہ امتیاز وہ عشق، عشق ہی نہیں

کر گئی چشم مست کام، ہو گیا نشہ تمام
میکشو اب مرا سلام، فرصت مے کشی نہیں

دست طلب بڑھائے جا، یونہی صدا لگائے جا
اُس کے حریم قدس میں دیر ہے اندھی نہیں

بڑھ کے جہاد عشق میں جان گنوا دے اے خمار
موت کو زندگی بنا زندگی زندگی نہیں

خمار بارہ بنکوی

تیرا منھ گردش ایام کہاں تک دیکھوں
یہ بھیانک سحر و شام کہاں تک دیکھوں

جذبۂ عشق کو ناکام کہاں تک دیکھوں
ستم گردش ایام کہاں تک دیکھوں

حرف آتا ہے تری شان کرم پہ ساقی
اپنے ہاتھوں کو تہی جام کہاں تک دیکھوں

بے رخی آپ کی میرے دل مجبور کا صبر
کون آتا ہے مرے کام کہاں تک دیکھوں

اب وہ دل ہے نہ وہ دل کی امنگیں باقی
اور اب عشق کا انجام کہاں تک دیکھوں

ایک ہی در پہ تری عمر کٹی اے صابر
یوں تجھے بندۂ بے دام کہاں تک دیکھوں

صابر دہلوی

بگولے اس لئے منڈلا رہے ہیں میرے مدفن پر
کہ یہ دھبہ بھی کیوں باقی رہے صحرا کے دامن پر

شکستہ ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی
یہ کس نے ڈال دی پرچھائیں آ کر میرے مدفن پر

کمالِ دستِ وحشت آج وحشت کی نمائش کر
گریباں پر گریباں آئے دامن آئے دامن پر

قیامت ہیں یہ میرے خون کی بوندیں رنگ لائینگی
یہ افسانے مرتب ہو چکے ہیں اُن کے دامن پر

کُھلا بابِ اجابت وہ دعا نے رنگ دکھلایا
وہ دیکھو برق چمکی وہ گری آغوشِ دشمن پر

ڈبو دے مجھ کو اے بحرِ ندامت جوش میں آ کر
کوئی آنسو بہاتا آ رہا ہے میرے مدفن پر

اسے کہتے ہیں نالہ دیکھ یوں فریاد کرتے ہیں
ترا دل بھی تڑپ اُٹھا مرے اندازِ شیون پر

رہے مدِ نظر یہ بھی نشیمن پھونکنے والے
گرے اور پھر گرے آہوں کی بجلی تیرے گلشن پر

مری وہ خانہ بربادی کا منظر ارے چمن والو
ابھی تک یاد ہے بجلی گری تھی جب نشیمن پر

گلستاں میں کسی کا بجلیوں نے گھر جلا ڈالا
کوئی ہنستا رہا بیٹھا ہوا شاخِ نشیمن پر

زلیخا معجزہ دیکھا بھی کچھ تو نے سرِ محشر
ثبوتِ بیگناہی ثبت تھا یوسف کے دامن پر

یوسف سکندرہ راؤ

احساسِ زندگی

کیا وہیں سے کچھ احساسِ زندگی میں نے
جب اِک لطیف سی شے میکدے میں پی میں نے

خموش رہ کے دیا درسِ خامشی میں نے
کہی نگاہ سے رودادِ زندگی میں نے

شرابِ ناب کی توہین حضرتِ واعظ
شراب آپ نے پی یا شراب پی میں نے

جنونِ عشق کی خودداریاں ارے توبہ
نگاہ جانبِ منزل کبھی نہ کی میں نے

یہ دیکھ کر کہ زمانہ اجل کا آ پہنچا
اُٹھا کے پی لیا اک جامِ آخری میں نے

تری نظر کو جفا کار کہہ دیا ہے جہاں
خدا گواہ۔ وہاں کی ہے شاعری میں نے

تباہ کر گئی وارفتگیِ دل آخر
تری تلاش میں خود جیسے کی کمی میں نے

ہر التفات کو رہنے دے اے نگاہِ کرم
کہ اب بدل دیا معیارِ زندگی میں نے

نہ پوچھئے دلِ مضطر کو جو نظر آیا
مآلِ عشق پہ اکثر نگاہ کی میں نے

حریمِ زہد میں ڈھلتی رہے تو کارِ ثواب
وہ معصیت ہے جو پی لی کبھی کبھی میں نے

تری نگاہِ خلش آفریں کو یاد کیا
کمی جو درد میں محسوس کی کبھی میں نے

خمارِ بادہ بہ اندازِ بادہ ہے واحد
کہ توبہ توڑ کے تھوڑی سی آج پی میں نے

غزل

رازِ اُلفت کی جو دنیا کو خبر ہو جائیگی — زندگی دشوار سے دشوار تر ہو جائیگی
احتیاطِ شوق و ضبطِ آرزو کے باوجود — مجھ پہ جو گذرے گی اُنکو بھی خبر ہو جائیگی
آپ کے دامن سے وابستہ ہے میری زندگی — آپ جس عالم میں چاہیں گے بسر ہو جائیگی
اب مری جانب نظر ہے جب میں دیکھونگا ادھر — وہ نظر گھبرا کے صرفِ بام و در ہو جائیگی
کون میری سی کہے گا واقعہ یونہی سہی — ساری دنیا وہ جدھر ہونگے اُدھر ہو جائیگی
شکوہ تو کرتا مگر نیچی نظر کا کیا جواب — آہ لب تک آتے آتے بے اثر ہو جائیگی
یوں نگاہِ ناز کی جنبش کی کچھ قیمت نہیں — جب بھی دانستہ بچے گی کارگر ہو جائیگی
دل کی بیتابی سزا رنگِ تغافل دیکھکر — کون کہتا تھا کہ اپنی بھی بسر ہو جائیگی

آپ نخشب اضطرابِ دل سے کیوں گھبرا گئے
رفتہ رفتہ یہ کڑی منزل بھی سر ہو جائیگی

نخشب

شریکِ زندگی

سوا دو بج گئے سورج میں لیکن کم نہیں تیزی — زمیں پر آسمانوں سے برابر ہے شرر ریزی
کوئی گرمی سی گرمی ہے نکلنا گھر سے بھاری ہے — مرمت کا مگر پختہ سڑک پر کام جاری ہے
کبھی مٹی سے مزدوروں کے چہرے اٹ جاتے ہیں — سڑک کے گھاؤ بھوری کنکروں سے پٹ جاتے ہیں
ہے پیدا زیر و بم سا دُرمٹوں کی ضربِ پیہم سے — درودیوار کے ماتھے ٹھنکتے ہیں دھمادھم سے
جہاں جس آگ میں برپا ہے یہ ہنگامِ مجبوری — وہیں ہیں ایک بیوی اور شوہر محوِ مزدوری
پٹے جھٹوں سے جلتی کنکریں بھر بھر کے لاتے ہیں — قیامت ہے مگر دونوں قدم یکساں اُٹھاتے ہیں
وہ آتے ہیں تو نظریں کام کر جاتی ہیں راہوں سے — پلٹتے ہیں تو کرنیں مل ملاتی ہیں نگاہوں سے
مجھے لینا کہ جم کر رہ گئی آنکھوں میں حیرانی — کہ ناداری میں عورت استقدر شوہر کی دیوانی
برابر ہے مگر بڑھکر قدم یوں دھرتی جاتی ہے — رُخِ شوہر پہ سایہ ٹوکری سے کرتی جاتی ہے
یہاں معیارِ ہمدردی عجب تسلیم ہوتا ہے — کہ دو روحوں میں بارِ زندگی تقسیم ہوتا ہے

یہ ہے وہ شمع جو ہمراہ پروانہ کے جلتی ہے — یہ وہ منزل ہے جو اپنی راہ روکے ساتھ چلتی ہے
جبینِ ہند کی کھوئی ہوئی تابندگی یہ ہے — بجا ہے ناز جس پر وہ شریک زندگی یہ ہے
یہ ہے خاتونِ مشرق جاں نثاری اسکی فطرت ہے — سہاگ اس کا وفا ہے یہ محبت ہی محبت ہے
یہ باوصف تباہی شاد ہے مسرور رہتی ہے — طلاق اسکے تصور کی حدوں سے دور رہتی ہے
اطاعت بے غرض اسکی وفائیں بے ریا اسکی — محبت کا نتیجہ سوچنے بیٹھے بلا اس کی
یہ نظارے حریم کج کلاہی میں نہیں ملتے — یہ جذبات وفا ایوان شاہی میں نہیں ملتے

زمانہ گو روا رکھتا ہے بیداد و ستم اس پر
قیامت تک کرے گی ناز تاریخ وطن اس پر

احسان بن دانش

سرورِ بیخودی

سرورِ بیخودی کامیاب لایا ہوں — تیری نظر سے چرا کر شراب لایا ہوں
متاعِ درد و غمِ اضطراب لایا ہوں — تجلیوں کا مکمل جواب لایا ہوں

ترے کرم کے بھروسہ پہ حشر میں یارب
گناہ لایا ہوں اور بے حساب لایا ہوں

شعری بھوپالی

یاد بخیر

مغرب میں وہ اک تارہ چمکا اور شام کا پرچم لہرایا
اک پھول پہ اک موتی چمکا فطرت نے وہ آنچل پھیلایا
اک گرم سا قطرہ آنکھوں میں پلکوں سے الجھ کر تھرآیا ——— دل نے اِک دھچکا سا کھایا
کیا کہئے مجھے کیا یاد آیا

یہ کھیتوں پہ ہلکا سا کہرا اور وقت کی یہ ظلمت کوشی

یہ ڈھندلے ڈھندلے جنگل سے سناٹے کی مبہم سرگوشی
یہ کانپتے لب، جلتی سانسیں، جذبات کی مبہم بیہوشی

میں خود سے بھی جیسے گھبرایا
کیا کہئے مجھے کیا یاد آیا

ٹیلے کی طرف چرواہے کی بنسی کی صدا ہلکی ہلکی
اور شام کی دیوی کی چُنری شانوں سے پرے ڈھلکی ڈھلکی
رہ رہ کے دھڑکتے سینے میں احساس کی مے چھلکی چھلکی

پھر دل نے تبسم فرمایا
کیا کہئے مجھے کیا یاد آیا

یہ گذرے ہوئے انجن کا دھواں لہرایا ہوا بادل جیسے
یا اک الھڑ کی آنکھوں میں پھیلا پھیلا کاجل جیسے
یاد آتے ہوئے لمحوں کا سماں بجتی ہوئی اک چھاگل جیسے

اک بات نے کتنا تڑپایا
کیا کہئے مجھے کیا یاد آیا

اس یاد کی کیفیت دل میں پائیں تو سناٹے ٹوٹ چلیں
بہتے ہوئے دھارے رُک جائیں آکاش سے جھرنے پھوٹ چلیں
بل کھا کے جوانی رہ جائے جذبات کی نبضیں چھوٹ چلیں

نظریں بہکیں، سر چکرایا
کیا کہئے مجھے کیا یاد آیا

مجروح سلطانپوری

قیدی کی مجبوری

میں اس خاموش بستی میں ہزاروں گیت گاتا ہوں
میں دیواروں پہ اپنی آہ کی مہریں لگاتا ہوں
میں اکثر رات کی دیوی کا گھونگھٹ کھول لیتا ہوں
اچانک پاؤں کی زنجیر ایک جھنکار کرتی ہے
کوئی سوئی ہوئی سی یاد دل پر وار کرتی ہے
کسی کا پیار اور میں، اُف خیالِ خام کا عالم!

میں اس شمشان ویرانے میں یہ دولت لٹاتا ہوں
میں خود جا کر ستاروں کو سنہری دھوپ لاتا ہوں
اور اُس کی آنکھ کے انمول موتی رول لیتا ہوں
کہ جس کی ایک پھیکی نقل خود دیوار کرتی ہے
کوئی معصوم لڑکی کیا مجھے بھی پیار کرتی ہے؟
یہ ویرانی اور میری زندگی کی شام کا عالم!

کوئی ایسا بھی ہے جو میرے نغمے گنگناتا ہے
اور میری مٹنے والی یاد کو جھولے جھلاتا ہے

یہ ممکن ہے کوئی میرے لئے آنسو بہاتا ہے
اُمڈ کر کیا کسی کے دل میں میرا پیار آتا ہے

الگ ہٹ میری وحشت یہ تری دیوانگی کیا ہے
مجھے عورت کے آنسو پر ذرا کچھ کم بھروسا ہے

میں قیدی ہوں مری یہ بیڑیاں ہی میرا زیور ہیں
میں مفلس ہوں مری جھولیاں ہی میرا زیور ہیں

مرے دامن کی باقی دھجیاں ہی میرا زیور ہیں
مرے جذبات کی خاموشیاں ہی میرا زیور ہیں

میں فخر آدم آدم کی قسم رسوا نہیں ہوں میں
میں خود ثابت قدم ہوں دختر حوا نہیں ہوں میں

سُنا ہے میری خاطر لوگ آوازیں اٹھاتے ہیں
مجھے آزاد کرنے کے لئے نعرے لگاتے ہیں

وہ میرے واسطے خاموش راتوں کو جگاتے ہیں
ستم کے خون سے دل کے چراغوں کو جلاتے ہیں

مگر چنگاریوں کو شاد کوئی کر نہیں سکتا
سوا میرے مجھے آزاد کوئی کر نہیں سکتا!

مجھے وہ طاقتیں دے پھونک دوں سارے بیاباں کو
مجھے وہ طاقتیں دے روک دوں ظلمت کے طوفاں کو

یہی جی چاہتا ہے توڑ دوں دیوارِ زنداں کو
لگا دوں آگ اس کنجِ قفس کے ساز و ساماں کو

مجھے تاریکیوں سے سخت نفرت ہوتی جاتی ہے
مگر یہ ہتھکڑی حرفِ مصیبت ہوتی جاتی ہے

غزل

بے چین

مجھے جو دل تو حقیقت کی لو نکلتی ہے
یہ شمع گل ہو تو ہر شے بہ بہ جلتی ہے

سکونِ قلب اُسے عمر بھر نہیں ممکن
کہ جس کے دل میں ہوا آرزو کی چلتی ہے

نکل گیا تھا جی چاہوں سو اب ہوا یہ دنیا
عبث ملال ہے بیکار ہاتھ ملتی ہے

خبر نہیں دلِ زخمی کے حال کی لیکن
لہو میں ڈوبی ہوئی آرزو نکلتی ہے

جگا دیا مجھے دشمن نے مار کر کانٹا
خدا بھلا کرے دل سے دُعا نکلتی ہے

جو مٹ رہی ہے تمنّا بلا سے مٹ جائے
دلِ غریب کو کمبخت کیوں مسلتی ہے

ہمارے واسطے فردوس سے بھی ہو بڑھ کر
وہ بزم جس میں محبّت کی بات چلتی ہے

کوئی زمین ہو جو سر نکال لاتا ہوں
ہو کوئی رنگ طبیعت کہیں بدلتی ہے

ہم اپنے آپ کو گوہر گراں بناتے ہیں
بلا سے یا دنیا لفظ جو چلتی ہے

رُباعیات

جو اک نظر کی جنبش سے سب دل کی بستی لوٹ گیا (۱) وہ جس سے آنکھیں چار ہوئیں اور ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا
دل اُس کا بھی ہے میرا بھی ہے فرق شکیلؔ اتنا لیکن وہ پتھر تھا جو ثابت ہے یہ شیشہ تھا جو ٹوٹ گیا

وہ گرمیٔ بزمِ عشق گئی وہ مہر و وفا کے گیت گئے (۲) جب حوصلۂ دل پست نہ تھا ہاں ہاں وہ زمانے بیت گئے
ہم شانِ تحمل پر نازاں تم جورِ مسلسل پر قائم للہ یہ بازی رہنے دو ہم ہار گئے تم جیت گئے

نقوشِ محبت

جنوں سے گزرنے کو جی چاہتا ہے
ہنسی ضبط کرنے کو جی چاہتا ہے

جہاں عشق میں ڈوب کر رہ گئے ہیں
وہیں پھر اُبھرنے کو جی چاہتا ہے

وہ ہم سے خفا ہیں ہم اُن سے خفا ہیں
مگر بات کرنے کو جی چاہتا ہے

ہے مدت سے بے رنگ نقشِ محبت
کوئی رنگ بھرنے کو جی چاہتا ہے

بہ ایں خود سری و غرورِ محبت
انھیں سجدہ کرنے کو جی چاہتا ہے

نظامِ دو عالم کی ہو خیر یارب
پھر اک آہ کرنے کو جی چاہتا ہے

قضا مژدۂ زندگی لیکے آئے
کچھ اس طرح مرنے کو جی چاہتا ہے

تری انجمن میں ہمہ رنگ ہو کر
مسلسل نکھرنے کو جی چاہتا ہے

گناہِ مکرر شکیلؔ اللہ اللہ
بگڑ کر سنورنے کو جی چاہتا ہے

شکیلؔ بدایونی

آجا!

صدرِ انجمن ماہ اے میرے انجم
ضیائے طالع اختر لئے ہوئے آجا

شگفتگی کو ترستا ہے زندگی کا چمن
جبیں پہ موجِ گُلِ تر لئے ہوئے آجا

جھکائے عارضِ گلفام پر حسیں پلکیں
ہر ایک پھول پہ نشتر لئے ہوئے آجا

ادھر بھی موڑ عنانِ تبسمِ پیہم
ادھر بھی بارشِ گوہر لئے ہوئے آجا

تجھے قسم ہے تری پر جمال باہوں کی
گلے کے واسطے خنجر لئے ہوئے آجا

نہ پھول ہیں کوئی خوشبو نہ شمع میں کوئی نور
ہر ایک شئے کا مقدر لئے ہوئے آجا

لگا دے آگ میری ظلمتوں کے خرمن میں
شرار و برق کے تیور لئے ہوئے آجا

ڈبو دے کشتیِ دل، نور کے تلاطم میں
تجلیوں کا سمندر لئے ہوئے آجا

ترے بغیر تو سونا پڑا ہے میخانہ
کبھی تو شیشہ و ساغر لئے ہوئے آجا

جاں نثار اختر

داغِ دل

برابر خفا ہوں برابر منائیں
نہ وہ باز آئیں نہ ہم باز آئیں

کسی اور کو داغِ دل کیوں دکھائیں
تمھاری کہانی تم ہی کو سنائیں

محبت کا دریا ہے اور غم کی لہریں
یہ جی چاہتا ہے یہیں ڈوب جائیں

بس اب انتہا ہو چکی ضبطِ غم کی
کہ رونے کو جی چاہے اور مسکرائیں

حقیقت میں وہ میکدہ میکدہ ہے
جہاں بے پئے ہی قدم ڈگمگائیں

کہاں تک خفا اُن کو رکھو گے شعری
چلو آج چل کر انھیں پھر منائیں

شعری بھوپالی

منزلِ آخر

شبِ فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں اُن کی توجہ سی پائی جاتی ہے

وہ اک نظر جو بمشکل اُٹھائی جاتی ہے
وہی نظر رگ و پے میں سمائی جاتی ہے

قدم قدم مری ہمت بڑھائی جاتی ہے
نفس نفس تری آہٹ سی پائی جاتی ہے

نقابِ حسنِ دو عالم اُٹھائی جاتی ہے
مجھی کو میری تجلی دکھائی جاتی ہے

ہمیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے
مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے

بنا بنا کے جو دنیا مٹائی جاتی ہے
ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے

جنونِ عشق کا یہ انتقام اللہ رے توبہ!
وہ رو رہے ہیں ہنسی مجھکو آئی جاتی ہے

گناہگار کے دل سے نہ بچکے چل زاہد
یہیں کہیں تری جنت بھی پائی جاتی ہے

وہ چیز کہتے ہیں فردوس گم شدہ جسکو
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

قریبِ منزلِ آخر ہے الفراق جگر
سفر تمام ہوا نیند آئی جاتی ہے

جگر مرادآبادی

حصہ نثر

ادبی مقالات

اقبال کی تلمیحات و اشارات

اقبال کی حیثیت نہ صرف ایک شاعر کی بلکہ مفکر کی، اور نہ صرف مفکر کی بلکہ مصلح کی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے نثر سے زیادہ شعر ہی کو اپنی فکر کا ترجمان اور اصلاح کا ذریعہ قرار دیا۔ انھوں نے شعر کے پیمانوں میں بھر بھر کر حقائق کی شراب کا فیض اس قدر عام کر دیا کہ "منبر کے میخانے جو تین سو سال سے بند پڑے تھے" وہ درحقیقت بانگ نوشا نوش اور صدائے ہا و ہو سے گونج اُٹھے۔ اُن پر اور ان کے کلام پر اہلِ فن نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجایش ہے۔

اِسی سلسلے میں بعض احباب نے ایک خاص پہلو پر خامہ فرسائی کی تحریک کی جس کا نتیجہ سطور ذیل ہیں۔ میری مراد اُن دُر ہائے شاہوار سے ہے جو کلام اقبال میں جا بجا تلمیحات و اشارات کی صورت میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے اُن کو استقصا کے بعد سلک انتظام میں منسلک کر دیا جائے اور شعر لکھ کر ہر تلمیح اور اشارے کی ضروری تشریح کر دی جائے۔ تاکہ اقبال کے سمجھنے میں سہولت ہو۔ اسی کے ساتھ جب ہم خیال کرتے ہیں کہ ملک میں عربی و فارسی کا مذاق روز بروز کم ہو رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ ربع صدی کے بعد مسلمانوں کی آیندہ نسلیں اس مذاق سے اور بھی بیگانہ ہو جائیں گی تو اس کام کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

میرے ایک بزرگ جو خود صاحب علم اور اس نواح میں ایک معزز عہدے پر ممتاز تھے اور جنھوں نے طویل عمر پائی اپنے وطن کے علمی ذوق کی رفتار کے بارے میں فرماتے تھے کہ ہم لڑکپن میں خاندان اور محلے کے بہت سے ارباب جبہ و دستار کو دیکھا کرتے تھے کہ اوقات فرصت میں متنبی اور ابو نواس کی شاعری پر سرگرم بحث ہیں۔ جب جوانی آئی تو وہ چرچے تو کم ہو گئے۔ البتہ عرفی و نظیری کے مباحث سننے میں آجاتے تھے۔ بڑھاپے میں زمانے نے وہ بساط بھی اُلٹ دی۔ ہاں داغ و امیر کے تذکرے رونق محفل رہ گئے۔ راقم سطور اس میں اتنا اور اضافہ کرنے کی جرات کرتا ہے کہ اب یہ باتیں بھی خواب و خیال ہوتی جا رہی ہیں۔ اور افکار و حوادث زمانہ کی بدولت کم و بیش ہر جگہ یہ حال ہے۔

کہ یاراں فراموش کردند عشق

لیکن یہ کام جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا بجائے خود کافی دشوار ہے۔ کیونکہ اقبال کے کلام میں عربی و فارسی ادب اور اسلامی علوم کے علاوہ فلسفہ قدیم و جدید، تاریخ، سیرت، جغرافیہ، سیاست وغیرہ کے اس قدر اشارات منتشر ہیں جن کی تشریح و توضیح وقت اور محنت چاہتی ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ مختلف مباحث مختلف ماہرین کو بانٹ دیے جائیں۔ تاکہ ہر فرد اپنے اپنے فن کو مرتب کر کے پیش کرے اور اس طرح کلام اقبال کی ایک جامع فرہنگ تیار ہو جائے۔ جو چیز آج کی صحبت میں پیش کی جا رہی ہے وہ دراصل ایک ناتمام سا خاکہ ہے جو اسی بنیاد پر بطور نمونہ صرف بال جبریل کے سرسری مطالعے سے ترتیب حروف تہجی کی مطابق مرتب کیا گیا ہے

تمدن، تصوف، شریعت، کلام　　　بتانِ عجم کے پجاری تمام

ایبک و غوری۔ ایبک سے قطب الدین ایبک مراد ہے جو خاندانِ غلامان کا بانی اور دہلی کا بادشاہ گزرا ہے۔ اس کی مدت سلطنت ۱۲۰۶ء سے ۱۲۱۰ء (۶۰۲ھ-۶۰۷ھ) ہے۔ قطب الدین دراصل شہاب الدین محمد غوری معروف بہ معز الدین سام فاتح ہند کا غلام تھا۔ اقبال کے نزدیک ایبک و غوری کے مقابلے میں امیر خسرو کے کارنامے زیادہ پائیدار اور ممتاز ہیں۔

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی　　　ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

بازوئے حیدرؓ۔ حیدر یعنی شیرِ درندہ لقب ہے حضرت امیر المومنین سیدنا علیؓ کا۔ آپ کے علم و شجاعت اور زہد و عبادت کے زریں واقعات صفحاتِ تاریخ کی زینت ہیں۔ اہلِ مغازی نے لکھا ہے کہ آپ نے جنگِ خیبر میں قلعے کا دروازہ جس کو متعدد آدمی بمشکل ہلا سکتے تھے تنہا دستِ حق پرست پر اٹھا لیا اور جنگ مذکور کو فتح کر کے محبِّ اللہ و رسولہٗ و محبوبِ اللہ و رسول کے مصداق ٹھیرے۔ خود فرماتے ہیں کہ جب میں صفِ دشمن میں گھستا ہوں تو یہ پروا نہیں کرتا کہ میں موت کی طرف جا رہا ہوں یا موت میری طرف آ رہی ہے۔ اسی کے ساتھ زہد کا یہ حال تھا کہ خشک نانِ جویں آپ کی مرغوب غذا تھی جس کو پانی میں تر کر کے کبھی نمک کے ساتھ اور کبھی بغیر نمک کے تناول فرماتے تھے۔ اقبال ہر مسلم کے لئے اُسی قوت کی دعا کرتے ہیں۔

ہے نانِ جویں بخشی ہے تو نے　　　اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

بُت کدۂ صفات۔ صوفیہ کے نزدیک تجلی حق بہ اسماء و صفات ظہورِ تعینات کا سبب ہوئی ہے جس کو عالم سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ تعینات کثرت محض اعتباری کہی جا سکتی ہیں۔ اور نورِ ذات کے ظہور سے معدوم اور فنا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے توحید کے معنی یہ ہیں کہ لا موجود الا اللہ پر یقین رکھے۔ ورنہ ماسوا کا وجود ماننے سے دوئی کا اعتقاد لازم آئیگا جو تصوف میں شرک یا بت پرستی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　　　غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

بُوعلی۔ شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ ابن سینا مشہور فلسفی حکیم اور مصنف جو ۳۷۰ھ میں بمقام بخارا متولد ہوا اور ۴۲۸ھ میں اصفہان میں رہ گرائے عدم ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دس برس کی عمر میں علم و فضل میں ممتاز اور غضب کے حافظے سے سرفراز ہو گیا تھا۔ اقبال حکمت یونانی اور حکمت ایمانی کا فرق بوعلی اور رومی کے تعلق سے بتاتے ہیں۔

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں　　　رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

بوالحسن۔ یا ابوالحسن حضرت علی مرتضیٰؓ کی کنیت ہے [illegible]

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے　　　کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

اس میں وہ دقیق مباحث و تعلیمات اقبال کی اساس ہیں۔ نیز ایسے آسان اشارات جو عام طور پر مشہور ہیں قصداً ترک کر دیئے گئے ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

اردشیر ۔ بابک کا بیٹا جو اردشیر بابکان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایران کے ساسانی خاندان کا بانی گزرا ہے ۲۲۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اور چودہ سال حکومت کر کے ۲۴۰ء میں انتقال کر گیا۔ اقبال کے یہاں محض بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی ۔۔۔ کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اسمٰعیلؑ بن ابراہیم علیہما السّلام۔ جن کے ایثار و قربانی کا واقعہ قرآن مجید میں مسطور اور آج تک ملت اسمٰعیلؑ میں بطور یادگار محفوظ ہے۔ اقبال نے اس اسوۂ حسنہ کو متعدد مقامات پر نہایت موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی ۔۔۔ سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آداب فرزندی

دوسری جگہ حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ جناب امام حسینؑ کے سرفروشانہ کارنامے کو اسلامی زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم ۔۔۔ نہایت اسکی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

افلاطون یا فلاطون (Plato) یونان کا نامور فلسفی۔ سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد۔ ایتھنیہ کا باشندہ۔ جو ۴۲۷ ق م میں پیدا ہوا اور ۸۰ برس کی عمر پاکر ۳۴۸ ق م میں رحلت کر گیا۔ عالم مثال اور وحدۃ الوجود کے خیالات سب سے پہلے اسی کے یہاں ملتے ہیں۔ مکالمات اور جمہوریت اس کی تصنیفات ہیں جو اہل علم میں ہمیشہ قدر کی نظر سے دیکھی گئی ہیں۔ مگر اقبال کی ہمت رفیع فکر افلاطون اور دولت قارون دونوں سے مستغنی ہے۔

ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستیٔ شوق ۔۔۔ نہ مال و دولت قارون نہ فکر افلاطون

المنی ۔ یا المانی۔ المانیہ کا باشندہ۔ جرمن۔ اقبال کے شعر۔

دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دیں ۔۔۔ جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں

میں مارٹن لوتھر (Luther) (۱۴۸۳ء تا ۱۵۴۶ء) مشہور جرمن مصلح کی خدمات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ شروع میں رومن کیتھولک تھا۔ بعد کو "کلیسا کی خرافات" کے خلاف بغاوت کر کے فرقہ پروٹسٹینٹ کا بانی ہوا۔

اندیشۂ عجم ۔ اقبال کا خیال ہے کہ قرون اولیٰ کے بعد مسلمانوں کا سادہ مذہب اور تمدن بہت کچھ عجمی یا غیر اسلامی تصورات سے متاثر ہو گیا۔

ذرا سی بات تھی۔ اندیشۂ عجم نے جسے ۔۔۔ بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے۔

دوسری جگہ اسی مفہوم کو زیادہ واضح کر دیا ہے۔

ہیں آپ ہی کی ذات اقدس مراد ہے کیونکہ نہج البلاغۃ میں آپ سے یہ قول منقول ہے۔ انّہٗ یموت من مات مِنّا ولیس بمیت
جو مرتا ہے وہ انسانوں کے نزدیک مرجاتا ہے لیکن اس کی روح نہیں مرتی۔

بوئے یمن۔ ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو محدثین نے موضوع قرار دیا ہے۔
حدیث یہ ہے۔ اِنّی لاجد نفس الرحمٰنؐ من قبلِ الیمن مجھے یمن کی جانب سے خدا کی خوشبو آتی ہے۔ گویا یہ اشارت دیشارت
حضرت اویس قرنی سے متعلق ہے جو یمن کے رہنے والے تھے۔ ہسپانیہ کی تعریف میں اقبال کا شعر ملاحظہ ہو۔

بوئے یمن آج بھی اُس کی ہواؤں میں ہے   رنگ حجاز آج بھی اُس کی نواؤں میں ہے

پاژند۔ ژند کی شرح جو پارسیوں کی مذہبی کتاب اوستا کی پہلوی تفسیر ہے۔

احکام ترے حق ہیں۔ مگر اپنے مفسّر   تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

تبریز۔ آذربائیجان کا دارالحکومت۔ اقبال کے شعر میں اس کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ وہ شمس تبریزی کا مولد ہے۔ شمس کے
والد کا نام علاؤ الدین تھا۔ علوم ظاہر کی تحصیل کے بعد وہ بابا کمال الدین جندی۔ اور بقول بعض شیخ رکن الدین سنجابی کے مرید ہوئے۔ سیاحت
کرتے ہوئے ۶۴۲ھ میں قونیہ میں گذر ہوا اور مولانائے روم پر نظر پڑ گئی۔ مولانا کے کلام میں جو سوز و گداز کی جلیاں نظر آتی ہیں وہ
شمس ہی کی گرمی صحبت کا فیض ہیں۔ یہ صحبت ۲ ماہ رہی بالآخر شمس تبریزی غیر معلوم طور پر ۶۴۴ھ میں غائب ہو گئے۔ مولانا کا ضخیم دیوان
جو غلطی سے دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے شمس سے ان کی غیر معمولی ارادت کا پتہ دیتا ہے۔

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے   وہی آب و گِل ایراں وہی تبریز ہے ساقی۔

ترکانِ عثمانی۔ ترک جو صدیوں تک یورپ و ایشیا کے مقبوضات پر فرمانروا۔ حرمین شریفین کے خادم اور خلافت اسلامیہ
کے وارث رہے۔ سابق جنگ عظیم کے بعد ترکی کی رہی سہی عظمت بھی تمام ہو گئی تھی۔ آخر کمال پاشا نے کمال جرأت سے کام لیکر ترک
کو پنجۂ اجانب سے چھڑایا اور قوم کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال لیا۔ ذیل کے شعر میں اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عثمانی بھی ترک تھے
اور ہند کے تیموری بھی ترک۔ مگر اول الذکر گر کر سنبھل گئے۔ مگر آخر الذکر ایسے گرے کہ پھر اُبھرنے کا نام نہ لیا۔

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ   نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے   وہ قوم جس نے گنوائی متاعِ تیموری

اسی کے ساتھ وہ یہ کہہ کر ترکوں کو متنبہ بھی کرتے ہیں۔

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا   ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

جنید و بسطامی - جنید بغدادی خواہرزادہ و خلیفہ سری سقطی متوفی ۲۹۷ھ اور بایزید بسطامی متوفی ۲۶۱ھ دونوں کا شمار اکابر صوفیہ میں ہے۔ اُن کے حالات غایت شہرت کی بنا پر نظر انداز کئے جاتے ہیں۔

حلّاج - حسین بن منصور نام۔ پیشہ ندّافی۔ سکونت شہر بیضا۔ عموماً باپ کے نام (منصور) سے یاد کئے جاتے ہیں۔ حضرت عشق کا خدا بھلا کرے کہ نام بھی بے نشان ہو گیا فنا ہو تو ایسی ہو۔ ۳۰۹ھ میں خلیفہ بغداد المقتدر باللہ کے حکم سے انا الحق کہنے کے جرم میں دار پر چڑھائے گئے۔ نہ صرف اہل شریعت بلکہ ارباب طریقت میں بھی بعض بزرگ اُن کے منکر گذرے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں۔

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی کہ وہ حلّاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب

حور و خیام - قرآن مجید کی آیت حورٌ مقصوراتٌ فی الخیام کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی حوریں جو اپنے خیموں میں بند بیٹھی ہیں۔

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

حیرت - ارباب تصوف نے حیرت کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک محمود۔ دوسری مذموم۔ پہلی تو وہ کیفیت ہے جو سالک پر مشاہدہ تجلیات سے طاری ہوتی ہے من عرف اللہ قل کلامہٗ و دام تحیرہٗ۔ دوسری وہ سرگشتگی جو منکرین حق کا خاصہ ہے۔ شعر ذیل میں بھی اسی تقسیم کی طرف اشارہ ہے۔

ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی

دولت پرویز - خسرو پرویز شاہ ساسانی آٹھ خزانوں کا مالک تھا۔

فقیر راہ کو بخشے گئے اسرار سلطانی بہا میری نوا کی دولت پرویز ہے ساقی

رازی - امام فخر الدین محمد رازی مشہور شافعی فقیہ، مفسر و متکلم۔ آپ ۵۴۴ھ میں بمقام رے متولد ہوئے اور ۶۰۶ھ میں بمقام ہرات سفر آخرت کیا۔ اقبال نے اکثر رومی کو عرفانیات۔ اور رازی کو عقلیات کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

رومی - مولانا جلال الدین محمد رومی بن سلطان العلماء بہاؤ الدین ولد۔ آپ کا اصلی وطن بلخ تھا مگر ۶۱۰ھ میں خوارزم شاہ کی مخالفت کے باعث آپ کے والد کو مع اہل و عیال ترک وطن کر کے قونیہ (روم) میں اقامت اختیار کرنی پڑی۔ مولانا ۶۰۴ھ ہجری میں کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ اپنے والد اور دوسرے فضلائے عہد سے تحصیل علوم کرنے کے بعد سید برہان الدین محقق ترمذی سے بیعت کی لیکن ہنوز آتش عشق دل کو اندر ہی اندر جلا رہی تھی کہ شمس تبریز کی صحبت نے جنبش دامن کا کام دیا اور متاع عافیت کو جلا کر خاک کر دیا۔ شمس کے غروب ہونے کے بعد صلاح الدین زرکوب کے انوار صحبت سے مستفید ہوئے۔ آخر ۶۷۲ھ میں آپ نے وصال فرمایا۔ خود ایک شعر میں اپنی زندگی کے تمام مراحل کا بیان نہایت ایجاز و بلاغت کے ساتھ فرماتے ہیں۔

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست　　خام بدم پختہ شدم سوختم

مولانا کی تصانیف میں فیہ ما فیہ۔ دیوان۔ اور مثنوی زیادہ مشہور ہیں خصوصاً آخر الذکر صدیوں سے مشرق و مغرب میں تصوف کا نہایت گراں قدر کارنامہ مانی جاتی رہی ہے۔ اقبال کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات و افکار میں مولانا سے بہت کچھ متاثر ہیں۔

رشی کے فاقے۔ شعر ذیل میں۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا برہمن کا طلسم　　عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

غالباً اُن حالات کی طرف اشارہ ہے جن کے ماتحت پچھلی مرتبہ گاندھی جی نے برت رکھا تھا تاکہ برہمن اچھوتوں کو اُن کے غصب کیے ہوئے حقوقِ انسانیت واپس کر دیں۔ مگر بے سود کیونکہ صدیوں کا زنگ مقاومت معمولی رگڑ سے نہیں چھوٹ سکتا۔

سالک و مقامات۔ سالک تقرب حق تعالیٰ کی راہ پر چلنے والے کو کہتے ہیں۔ اس راہ میں کئی مقام پیش آتے ہیں مثلاً توبہ۔ ورع۔ زہد۔ فقر۔ صبر۔ شکر۔ خوف۔ رجا۔ توکل۔ رضا۔ مقام سے نیچے احوال کا درجہ ہے یعنی محبت۔ شوق۔ غیرت۔ قرب۔ حیا۔ انس۔ ہیبت قبض و بسط۔ فنا و بقا۔ اتصال۔

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ　　ہر لحظہ ہے سالک کا مکاں اور زماں اور

سحر فرنگیانہ۔ یعنی مغرب کی سیاست کا طلسم جو گذشتہ جنگ عظیم کے بعد مشرق میں شکست ہو گیا۔

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ　　ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

سلمان۔ فارس کے رہنے والے جن کا مجوسی نام ماہ بہ یار روز بہ تھا۔ اسلام میں ابو عبداللہ سلمان خیر کہلائے اور جلیل القدر صحابہؓ میں شمار ہوئے۔ اپنے کو سلمان بن اسلام کہتے تھے۔ زبان نبوت نے سلمان منا اہل البیت کے اعزاز سے مشرف فرمایا۔ آخر طویل عمر پا کر ۳۶ھ ہجری میں راہی خلد ہوئے۔ توکل و قناعت آپ کا طغرائے امتیاز ہے۔

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

ایک جگہ سلمان سے فارسی شاعر مسعود بن سعد بن سلمان مراد لیا ہے جو لاہور میں پیدا ہوا۔ غزنویوں کی طرف سے ناظم رہا۔ اور عرصہ تک قید و بند میں اسیر رہ کر آخر ۵۱۵ھ میں اس جہان سے رحلت کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے فارسی دیوان کے علاوہ عربی اور ہندی میں بھی مجموعہ اشعار چھوڑا تھا۔

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان خوش آہنگ　　دنیا نہیں مردان جفاکش کے لیے تنگ

سلیم و سنجر۔ سلیم ترکی خلیفہ تھا جس نے ۹۱۸ھ سے ۹۲۶ھ تک نہایت شجاعت اور عظمت کے ساتھ حکومت کی اور سنجر سلجوقی سلطان بن ملک شاہ متوفی ۵۵۲ھ جس کی مدت سلطنت ایران میں ۴۰ سال ہے۔

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود   فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے حجاب

سنائی و عطار ۔ حکیم مجدود بن آدم سنائی غزنوی المتوفی ۵۲۵ھ اور شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری المتوفی ۶۳۲ھ صوفی شعرا کے پیشوا مانے جاتے ہیں۔ ان کے سوانح اور تصانیف غایت شہرت کی وجہ سے محتاج بیان نہیں۔ رومی نے اکثر ان کے کمالات کا نہایت عقیدت کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او   ما از پے سنائی و عطار آمدیم

اقبال نے بھی کئی جگہ کمال ارادت سے ان کا ذکر کیا ہے۔

سومنات ۔ کاٹھیاوار کا ایک ساحلی مقام جس کو محمود غزنوی نے فتح کر کے وہاں کے بڑے ..... بت کو توڑا ہے۔

کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں   بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات

شاہین ۔ اقبال کے پیغام میں اکثر مرد مومن کو شاہین کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ خود علامہ مرحوم نے اپنے ایک گرامی نامے میں میرے ایک عزیز کو تحریر فرمائی تھیں جن کا یہاں نقل کرنا کافی ہوگا۔ "اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات ہیں۔ (۱) خوددار و غیرتمند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (۳) بلند پرواز ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے۔ (۵) تیز نگاہ ہے۔" اشعار ملاحظہ ہوں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں   کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جوانوں کو مری آہ سحر دے   پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

کہیں شاہین کی بجائے باز یا شاہ باز بھی استعمال کیا ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں   اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

بعض جگہ اسی مفہوم کو عقاب کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں   نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

اس کے مخالف مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وہ کبھی کرگس، کبھی کنجشک اور کبھی ممولے کے استعارات سے مدد لیتے ہیں۔ مثلاً

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے   کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے   لڑا دے ممولے کو شہباز سے

شبانی ۔ گلہ بانی کا کام۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر نبی نے ایک زمانے میں گلہ بانی کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ شاید مصلحت ایزدی کا یہ اقتضا تھا کہ یہ خدمت شیوۂ انکسار تعلیم کرنے کے ساتھ انسانیت کی گلہ بانی کی تمہید ثابت ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم کی

شہادت ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو منصب نبوت تفویض ہونے سے پیشتر حضرت شعیبؑ کے یہاں یہ خدمت انجام دینی پڑی تھی۔

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں — وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللہی

اگر کوئی شعیب آئے میسّر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

شیخ مجدد۔ امام ربانی شیخ احمد سرہندی ملقب بہ مجدد الف ثانی ۹۷۱ھ میں ولادت اور ۱۰۳۴ھ میں وفات ہوئی۔ جامع شریعت وطریقت بزرگ گذرے ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں کلمہ حق کی بدولت قید وبند کے مصائب سے دوچار ہوئے۔ مگر راہ استقامت سے قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ اقبال کہتے ہیں۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار

ایک جگہ اور بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند — اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

شیشہ بازی۔ بازی گری۔ شیشہ باز۔ بازیگر جو سر پر شیشہ رکھ کر رقص کرتے ہیں۔ مجازاً دغاباز۔

یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے — تو ہے علم وحکمت فقط شیشہ بازی

صاحب کشاف۔ محمود بن عمر معروف بہ جار اللہ زمخشری۔ جو ایک زبردست معتزلی عالم اور تفسیر کشاف وغیرہ کے مصنف تھے۔ سال وفات ۵۳۸ھ ہے۔

ترے ضمیر پہ جبتک نہ ہو نزول کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

صاحب لولاک۔ لولاك لما خلقت الافلاك۔ ایک حدیث قدسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نبی کریم سے فرماتا ہے کہ اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔ محدثین نے اس حدیث کی صحت میں کلام کیا ہے۔ تاہم حدیث کے الفاظ نہ سہی بمفہوم میں کوئی شک نہیں۔ اقبال نے بہ تقاضائے ان الارض یرثہا عبادی الصالحون یہی مقام مرد مومن کے لئے ثابت کیا ہے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

ضرب کلیمی۔ قرآن پاک میں ضرب عصا کا ذکر دو موقعوں پر آیا ہے ایک مرتبہ حضرت موسیٰ نے حکم الٰہی سے بحر احمر پر عصا مارا دریا میں رستہ پیدا ہوگیا۔

کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار — جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے

دوسرا وہ موقع ہے جب پتھر پر عصا مارا اور پانی کے چشمے جاری ہوگئے۔

ہزار چشمے ترے سنگ راہ سے پھوٹیں — خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

طائرِ لاہوتی:۔ صوفیہ نے چار عالم مانے ہیں۔ ناسوت (عالمِ ظاہر)۔ ملکوت (عالمِ اسمار)۔ جبروت (عالمِ صفات) لاہوت (عالمِ ذات)۔ مومن کو طائرِ لاہوتی کہا گیا ہے کیونکہ اُس کی منتہائے پرواز قرب و وصلِ الٰہی ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

طُغرل:۔ خاندانِ سلجوق کا بانی اور عظیم المرتبت بادشاہ جو ۲۵ سال تک ایران میں کامیاب حکومت کرکے ۴۵۵ھ میں راہیِ عدم ہوا۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں — غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں

عالمِ بے رنگ و بو:۔ رنگ و بو سے مرتبۂ تعین۔ اور اس کی ضد سے مرتبۂ اطلاق مراد ہے۔ صوفی کہتے ہیں کہ جب تک تمام ممکنات مرتبۂ اطلاق میں تھے تو سوائے ذات کے کچھ نہ تھا۔ اور جمیع ممکنات علمِ ازلی میں تھے۔ ممکنات یا تعینات کی معراج یہی ہے کہ پھر مرتبہ سابقہ کی طرف رجوع کریں۔

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری — وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو — کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

اقبال اس مسئلے میں وجودیوں سے ذرا مختلف ہیں مگر اس کی تشریح کا یہ محل نہیں۔

غزالی:۔ حجۃ الاسلام امام محمد غزالی طوسی۔ دنیائے اسلام کے مایۂ ناز عالم، فلسفی، متکلم، صوفی اور مصنف جنھوں نے ۵۵ سال کی عمر میں ۵۰۵ ہجری میں سفرِ آخرت کیا آپ کے سوانحِ حیات اور تصنیفات پر مستند کتابیں ملتی ہیں۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی

غیب و حضور:۔ صاحب المنح المدنیہ کے بقول الغیبۃ اشتغال الحس بما ورد علیہ من علم احوال الخلق والحضور کونہ حاضراً بالحق۔ یعنی غیبت حواسِ انسانی کا احوالِ خلق کی طرف متوجہ ہونا۔ اور حضور حق تعالیٰ کے روبرو اپنے کو موجود سمجھنا ہے۔

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور — ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

فارابی:۔ شیخ ابونصر فارابی (المتوفی ۳۳۹ھ) جو فلاسفۂ اسلام میں کمال ذہانت سے موصوف اور معلمِ ثانی کے لقب سے معروف ہے۔

یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی — یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ

فاران:۔ عرب کا ایک پہاڑ جس کا حوالہ توریت میں آیا ہے۔

دلِ طورِ سینا و فارانِ دونیم — تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

فرانسیسی انقلاب:۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں فرانس کا وہ اہم تاریخی واقعہ جو فرنچ ریوولیوشن کہلاتا ہے۔

جشنِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

فرنگی شیشہ گر:۔ مغربی تہذیب کو اقبال نے شیشہ گر قرار دیا ہے۔ کیونکہ اسکے اثر سے محکوم مشرق کے قوائے عمل مفلوج اور صلاحیت فطرت مفقود ہو گئی۔

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا

کاظمہ۔ و کوہِ اضم:۔ کاظمہ مدینہ طیبہ کا نام ہے اور اضم مدینہ منورہ کے نواح میں ایک پہاڑ ہے یہ دونوں اشارات امام بوصیری کے نعتیہ قصیدہ بُردہ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

أم هبّت الريح من تلقاء كاظمة او اومض البرق في الظلماء من اضم

اقبال کہتے ہیں۔

گرد سے پاک ہے فضا برگِ نخیل دھل گئے ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

صُبح دکھو دیدیاں چھوڑ گیا سحابِ شب کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

کلیسا کی خرافات:۔ خرافہ عرب میں قبیلہ عذرہ کا ایک دروغ گو شخص گذرا ہے۔ اسی وجہ سے لغو باتوں کو خرافات کہتے ہیں۔ کلیسا کی خرافات سے عیسائی چرچ کے دور از کار اور خلاف عقل عقائد و اعمال مراد ہیں۔

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت میں جسکو سمجھتا تھا کلیسا کی خرافات

گرفتہ چینیاں احرام الخ:۔ اقبال نے اپنے شعر

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا

میں سنائی کے مصرع کو تضمین کیا ہے۔ اصل شعر یہ ہے۔

چو علمت ہست خدمت کن چو بی علماں کہ زشت آید گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا

حلاج کا بیان ہے کہ اب بھی موسم حج میں جب دور دور سے عازمین حج مکہ معظمہ میں حاضر ہوتے ہیں اکثر گرد و نواح کے لوگ اس سعادت سے محروم رہ جاتے ہیں سچ ہے نزدیکان بے خبر دور، و دوران باخبر در حضور۔

کلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ:۔ حضرت ابوذر غفاری سابقین اولین میں شامل ہیں اور صدق لہجہ اور کمال زہد میں درجۂ عالی پر فائز۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں عازم خلد ہوئے۔ حضرت اویسؓ قرنی تابعین کے اعلیٰ طبقے میں شمار ہوتے ہیں مشہور عاشق رسولؐ ہیں۔ مقبول الدعوات، اور زبردست متوکل گذرے ہیں۔ آپ جنگ صفین میں حضرت علی مرتضیٰؓ کی طرف سے لڑکر شہید ہوئے۔ اقبال شیخ حرم کی بذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے　　　گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ

لاتخف :۔ یہ لفظ قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے مثلاً جب ساحروں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے لاٹھیاں پھینکیں اور وہ سانپ بن کر دوڑیں تو آپ کو بہ مقتضائے بشریت خوف ہوا۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ لاتخف انك انت الاعلیٰ۔ ڈرو مت بیشک تم ہی غالب رہوگے۔ (سورۂ طٰہٰ)

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی　　　اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

لاتذر :۔ سیدنا نوح علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ نوح میں وارد ہے۔ رب لاتذر علی الارض من الکٰفرین دیّارا۔ اے میرے پروردگار ان کافروں میں سے زمین پر کسی متنفس کو بھی باقی نہ چھوڑ۔

دل مرد مومن میں پھر زندہ کردے　　　وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں

لایحزنون :۔ آیہ کریمہ الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیہم ولاھم یحزنون کا ٹکڑا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دوستانِ خدا کو ہرگز خوف و حزن سے کام نہ ہوگا۔

عطا اسلاف کا جذب دروں کر　　　شریک زمرۂ لایحزنون کر

مجذوب فرنگی ۔ جرمن فلسفی نطشے (NIETZSCHE) مراد ہے جو ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۰ء میں مرا۔ اقبال ایک حد تک اس کے ساتھ چلتے ہیں لیکن جب وہ بہکنے لگتا ہے تو اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں نطشے استدلال سے زیادہ جذبات کی اہمیت کا قائل ہے۔ اور عقل سے زیادہ وجدان کا پرستار۔ وہ خدا کا منکر، مذہب (مسیحیت) کا دشمن، معیار اخلاق کا غیر معتقد اور جمہوریت کا مخالف ہے۔ اس کی نظر میں قوت خیر ہے۔ اور کشاکشِ حیات ناگزیر۔ اس کے متضاد خیالات کی بنا پر اقبال اسکو مجذوب کہتے ہیں۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں　　　تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اقبال نے دوسری جگہ "دیوانہ بہ کارگہ شیشہ گر رسید" اور "قلب او مومن دماغش کافر است" کہہ کر فلسفی مذکور کے انداز فکر کی نہایت صحیح تصویر کھینچ دی ہے۔

معرّی :۔ ابوالعلاء احمد شام کے قریہ معرۃ کا رہنے والا (متوفی ۴۴۹ھ) ایک آزاد خیال نامور عربی شاعر ہوا ہے۔ اسکی تصانیف میں رسالۃ الغفران اور لزومیات کو خاص درجہ حاصل ہے۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی　　　پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ بسراوقات

مُلّا :۔ اقبال لکھتے ہیں۔

میں جانتا ہوں انجام اس کا　　　جس معرکے میں مُلّا ہو غازی

بہت ممکن ہے کہ یہ خیال رومی کی ایک حکایت سے پیدا ہوا ہو جس میں ایک صوفی معرکۂ جہاد میں تشریف لے گئے تھے لوگوں نے ان کو متزاید سمجھ کر زخمیوں کی نگرانی کے لئے چھوڑا اور خود جنگ میں چلے گئے۔ ان حضرات کو سخت ملال ہوا کہ ثواب جہاد سے محروم رہ گیا۔ آخر دوستوں نے رائے دی کہ اچھا تم کسی اسیر جنگ کو قتل کر کے غازی بنو۔ یہ تیار ہو گئے۔ مگر جونہیں اسیر کی غضب آلود نظر دیکھی ہوش اُڑ گئے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غریب زمین پر بدحواس و بیقرار اور وہ ان کی چھاتی پر سوار۔ آخر لوگوں نے آکر بہ مشکل ان کی جان چھڑائی۔

ہفتاد و دو ملت :- بہتر اسلامی فرقے۔ اس سلسلے میں ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ محل نظر ہے۔

کھو یا گیا جو مطلب' ہفتاد و دو ملت ہیں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

یورپ کا واویلا :- معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی دُوربیں نظر نے مغربی تمدن کے سمندر کی پرسکون سطح سے گذر کر اندرونی امواج کے تلاطم کا سراغ لگا لیا تھا۔ اشعار ذیل میں نیز دوسرے اشعار میں موجودہ ہلاکت آفریں جنگ کی پیشگوئیاں صاف صاف نظر آتی ہیں۔

دیار کھا ہے اُس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے ۔۔۔ بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا
خبر ملی ہے خدایان بحر و بر سے مجھے ۔۔۔ فرنگ رہ گزر سیل بے پناہ میں ہے

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ ایک ناتمام سی کوشش ہے ممکن ہے کہ بعض تشریحات تشنہ اور ناکافی ہوں اور بعض زائد اور غیر ضروری۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال کو سمجھنے کے لئے اس نوع کی کوشش بہت ضروری ہے۔ الغرض یہ داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔ کیا مناسب نہ ہوگا کہ اہل فن اس پر ایک فلک بوس عمارت بنائیں جہاں پہونچ کر اقبال کی عرش رس تخئیل کے قصر کا زینہ ہاتھ آجائے۔

"تا نہال دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم"

ضیاء احمد بدایونی۔ علیگڈھ

غزل کا نیا روپ

اردو ادب کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ ادبی رجحانات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ اردو ادب و زبان کے حق میں تخلیقی دور ہے، یعنی ایجاد و اختراع کا دور۔ کم و بیش ادب کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ایک طرف نئے اصطلاحات یا نئے محاورات اگر ہمارے ادب و زبان میں گوناگوں تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں تو دوسری طرف نئے خیالات نئے تخیلات اور نئے زاویے ادب و شاعری کی ماہیت میں ایک نیا انقلاب رونما کر رہے ہیں۔ موجودہ جنگ نے ان رجحانات میں اور تیزی پیدا کر دی ہے۔

یہ ایجاد و اختراع کا سلسلہ ہر زبان و ادب میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اور اسی کا نام ادبی نشو و نما ہے۔

چنانچہ تاریخ ادب اُردو بتاتی ہے کہ جب سرزمین دکن میں بزم ادب سجائی گئی اور ادب و زبان کی داغ بیل ڈالی گئی تو اساتذۂ متقدمین کا کام یہی ایجاد و اختراع تھا۔ ولی اورنگ آبادی، حاتم، آبرو، آرزو، ناجی وغیرہ ہم ابتدائی شعرا ہیں جن کا کام فارسی اور دیگر دیسی پراکرتوں سے الفاظ کا ذخیرہ اور خیالات کا انبار اخذ کرنا تھا۔ اسی عہد میں باغ ادب میں نئے پودے لگائے گئے۔ روشیں قایم ہوئیں اور گلدستے تیار ہوئے۔ جب یہ لوگ اپنا کام ختم کر چکے تو نئے باغبانوں کی باری آئی۔ ان کی نظریں اور تھیں، ان کا کام اور تھا۔ آئے اور آتے ہی خودرو درختوں کو اکھاڑ پھینک الگ کیا، بیڈھنگی شاخوں کو کاٹا، ناموزوں ٹہنیوں کو تراشا، کچھ ہی عرصہ میں اردو شاعری کا اچھا خاصہ خوشنما باغ تیار ہو گیا۔ انشاء اللہ خاں انشاء نے اُردو کی گرامر مرتب کی، ناسخ و آتش نے زبان کو صاف ستھرا کیا اور شاعری کے نئے اصول و قواعد بنائے۔ اس کے بعد جب ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا تو پرانی محفل میں کایا پلٹ ہو گئی۔ نہ وہ محفل رہی نہ وہ محفل والے۔ آزاد اور حالی ایسے ترقی پسند ادیبوں کی باری آئی اور ان اساتذہ نے گلدستۂ ادب میں نئے گل کھلائے۔ اسی زمانہ میں شاعری نے اپنا نیا روپ بدلا۔ غزلوں کی جگہ نظری نظموں نے لی۔ طرحدار مشاعرے بے طرح ہو گئے۔ چند ہی روز میں اچھا خاصہ انقلاب ہو گیا۔

نئے ماحول اور سماج میں تبدیلی کے باعث لوگوں کے نظریئے بدلے۔ ادب کی ماہیت بدلی اور نئے موضوعات کے لئے اسلوب بیان میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی تو دوربین نگاہوں نے اردو شاعری کا جائزہ لیا۔ اس کا میدان نہایت تنگ و تاریک نظر آیا۔ کل مایۂ بساط ایک "غزل" تھی جس کا دائرہ تنگ اور محدود تھا۔ رسوم و قیود نے ایسا جکڑا تھا کہ سوائے مخصوص مضامین کے نئے موضوعات کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ دراصل یہی وہ زمانہ تھا جبکہ غزل نے اپنا رہا سہا وقار کھو دیا اور لوگوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ "غزل" اپنی زندگی کی آخری منزل پر ہے۔ میرے نزدیک تنقید نگاروں میں مولانا حالی مرحوم نے سب سے پہلے اس کا احساس کر کے نئے راستوں کی تلاش شروع کر دی جس طرح ۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب نے "ورڈس ورتھ" Wordsworth اور دیگر رومانی شعرا پر اثر ڈالا تھا۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کے غدر سے متاثر ہو کر مولانا حالی نے "مقدمۂ شعر و شاعری" کے ذریعہ اپنی انتہا درجہ کی بیدار مغزی کا ثبوت دیا۔ واقعتاً

قدامت پرستی اور رسم پرستی رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی اور ہماری ذہنیت پر اس قدر جمود پیدا ہو چکا تھا کہ سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کوشش ہی ترک کر دی تھی۔ غزل کا معیار گرا اور بجائے "واردات قلبیہ" اور "امور ذہنیہ" کے رکیک مضامین کا دخل ایک فطری نتیجہ تھا۔ ہمارے شعرا کے پاس سوائے غزل کے اور کوئی آسان وسیلۂ اظہار بھی نہ تھا۔ کرتے تو کیا کرتے۔ ایجاد و اختراع کی حدیں پہلے ہی پوری ہو چکی تھیں نئے اصناف کا ڈھونڈنا گویا ساری سوسائٹی سے بغاوت کرنا تھا۔

الغرض پرانے تنقید نگاروں کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا کی سادگی اور بیساختگی رفتہ رفتہ تصنع اور بناوٹ میں تبدیل ہو گئی ملاحظہ ہوں۔ چند اشعار جو اساتذۂ متقدمین سے لیکر متاخرین تک کے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان سب کا موضوع ایک ہی ہے یعنی چشم معشوق۔

اے ولی دل کو آپ کرتی ہو	نگہ چشم سرمگیں کی ادا	ولی اورنگ آبادی
میر اُن نیم باز آنکھوں میں	ساری مستی شراب کی سی ہے	میر تقی میر
دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا	وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا	؍؍
کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا	ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں	مرزا سودا
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی	وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے	غالب
کھلے ہیں ناز سے گلشن میں غنچۂ نرگس	ذرا دکھا اُسے تو چشم نیم خواب توڑے	ذوق
مقابل آپ کی آنکھوں کے آہو ہو نہیں سکتا	انہیں کے آگے جادو گر سے جادو ہو نہیں سکتا	ناسخ
وہ سرمہ بھری آنکھیں فتنہ ہیں کہ جادو ہیں	کتنوں کو لگا رکھا کتنوں کو سلا رکھا	امیر مینائی
ہم نے دیکھی ہے کسی شوخ کی مستی بھری آنکھ	ملتی جلتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانہ سے	نامعلوم

یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن جب ایک صاحب کو کچھ ہاتھ نہ لگا تو یوں کہنے لگے۔

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو　　کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

نواب جعفر علی خاں صاحب اثر نے اسی مضمون پر ایک عجیب و غریب شعر کہا ہے سن لیجئے۔

جہاں پلکوں کے سایہ میں ہزاروں فتنے سوتے تھے　　وہیں فطرت نے چپکے سے نگاہ سرمگیں رکھدی

اگرچہ ارتقا اور تنزل کا اندازہ لگانے کے لئے چند اشعار سے شعرا کی مجموعی قیمت اور شاعری کے مختلف دوروں کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم کر لینا سخت بے انصافی ہوگی۔ تاہم میرا مقصد اس مقام پر نکتہ سنج ناظرین کو محض ایک اشارہ کر دینا ہے۔ تنوع پسندی انسانی فطرت ہے اور ہر شے میں تبدیلیوں کی گنجائش ایک حد تک ہوتی ہے اور یہ حد پوری ہو جانے کے بعد طبیعت فطرتاً اسکو ترک

کرلے پر مائل ہو جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو غزل کی زندگی سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ باقی رہی۔ ابھی حال ہی جب علم النفسیات نے ہمارے دماغی اور ذہنی زندگی کے متعلق نئے انکشافات کئے تو ہماری شاعری کو بھی بہت سے نئے مضامین ہاتھ لگ گئے اُردو غزل نے پھر سنبھالا لیا اور حسرت موہانی، فانی بدایونی، عزیز لکھنوی اور ریاض خیرآبادی وغیرہم نے غزل میں نئی روح پھونکدی جب ملک میں سیاسی آزادی کے حصول کے لئے ایک نیا مورچہ قایم ہوا تو شعرا نے بھی حب الوطنی کے راگ چھیڑے اور بغاوت کے نعرہ لگانے لگے۔ اقبال چکبست۔ اکبر الہ آبادی اور جوش ملیح آبادی وغیرہم اس فن کے مردمیدان ہیں بہرحال اس طرح غزل کی زندگی اب تک ششم پنشم گذرتی رہی۔

موجودہ پُرآشوب زمانہ میں جبکہ ہمارا دو اختراع کی ہرطرف سے بوچھار ہے اور زندگی کا فلسفہ موثر رہا ہے، صنف غزل کو اس طوفان میں محفوظ رکھنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم کسی خوشگوار تبدیلی سے کام لیں۔ غزل اُردو شاعری کی سب سے زیادہ مشہور و معروف صنف سخن سمجھی جاتی ہے۔ زمانہ حال میں بھی زیادہ تعداد ایسے ہی شعرا کی ہے جو اسی کے ذریعہ اظہار خیال کرتے ہیں لہذا غزل کے مستقبل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور ایک مفید نتیجہ پر پہونچنے کی سخت ضرورت ہے۔

غزل میں میرے نزدیک دو ہی قسم کے اختراعات کی گنجایش پائی جاتی ہے۔

(۱) ایک ہی موضوع اور ایک ہی خیال کو ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کیا جا دے یعنی مسلسل غزلیں کہی جا دیں۔ یہ چیز ہمارے یہاں کم و بیش موجود ہے اور اکثر شعرا مسلسل غزلیں لکھنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ تبدیلی غیر ارادی طور پر ہماری غزلوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ اور کوئی باقاعدہ کوشش اس امر کی جانب نہیں کی جا رہی ہے۔

(۲) دوسری تبدیلی جو میرے نزدیک زیادہ اہم ہے وہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی غزل کو قدیم ہندی شاعری کے طرز پر لے آئیں۔ موجودہ غزل کا ڈھانچہ کم و بیش فارسی غزل کے طرز پر ہے۔

شاعری میں اظہار عشق و محبت کے عموماً تین طریقے رائج ہیں یعنی مرد کی جانب سے عورت کی طرف، مرد کی جانب سے مرد کی طرف اور عورت کی جانب سے مرد کی جانب۔ اول الذکر فارسی کا دستور ہے اور یہی ہماری غزل میں رائج ہے یعنی مرد اپنے جذبات و واردات کا مرکز کسی صنف نازک کو بناتا ہے لیکن قدیم ہندی شاعری میں اس کا طریقہ بالکل برعکس ہے یعنی بجائے مرد کے عورت جو کسی مرد کے عشق میں فریفتہ و دلدادہ ہے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار اپنے ہی زبان اور طرز میں کرتی ہے۔ ہندی کی پرانی شاعری ابھی تک اسی پر قایم ہے۔ اردو شاعری میں مخاطب یا معشوق عام طور پر کچھ ایسی حیثیت رکھتا ہے کہ اسکو دونوں صنفوں سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ہمارے ادب میں ہندی شاعری کی یہ خصوصیت دو طرح پر پائی جاتی ہے۔ اوّل ریختی کی شکل میں۔ دوسرے اُردو گیتوں اور ٹھمریوں کی شکل میں۔

میری ذاتی رائے ریختی کے متعلق یہ ہے کہ اس کی ابتدا بھاشا اور دیگر دیسی پراکرتوں کے تتبع میں اولاً کی گئی تھی میرانجی نامی دکن کے مشہور شاعر نے دو دیوان چھوڑے ہیں جن میں سے ایک ریختی کے طرز میں ہے یہ کلام بمقابلہ اٹھارویں اور انیسوی صدی کی ریختی کے نہایت پراثر اور بے تکلف ہے۔ یہی طرز شاعری جس کا نام ہم نے انیسویں صدی میں ریختی رکھدیا درحقیقت ہندی شاعری کی نہایت کامیاب نقل تھی اور اگر اس میں ابتذال نہ پیدا ہوتا تو شاید اُردو ادب میں نہایت اعلیٰ صنفِ سخن قرار پاتی۔ الغرض وہ ابتدائی غزل جس کا نام ہم نے بعد میں ریختی رکھدیا اُسی مقام پر جم کر رہ گئی اور دلی اور نگ آبادی سے موجودہ غزل کی بنیاد پڑ گئی۔

ہم لوگ گیتوں اور ٹھمریوں سے اچھی طرح واقف ہیں ٹھمری دراصل ہندی شاعری کے قطعات ہیں جن کو تھوڑی بہت زبان کی تبدیلی کے ساتھ اپنا لیا گیا ہے ہمیں ان ٹھمریوں کو جن کی مثال ابھی پیش کی جاتی ہے اُردو کی ٹھمریاں اسی بنیاد پر کہتا ہوں کہ فارسی، عربی اور ہندی الفاظ کی لطیف آمیزش ہرگز ان کو اردو کے دائرہ سے نکال لینے پر اجازت نہیں دیتی۔ لکھنؤ کے ایک رئیس اور ماہر فن کی چند ٹھمریاں نمونتاً پیش کرتا ہوں۔

(۱) (ایک لڑکی اپنے عاشق کی کامیاب نظروں کا جائزہ لیتی ہے)

ایسو تم نے کدر لیا ۔ کس سے سیکھا تیر لگانا

بن جہ کے کمان پیارے ۔ ٹھہرے ٹھہرے تیر تمہارے ۔ من پہ دے ہیں ادر ہانے ۔ تا پہ چوکت نہیں نشانہ

(۲) (ایک حسین لڑکی ایک گگرا اپنے کولھے پر رکھے ہوئے گاؤں کے کنوئیں کی طرف جا رہی ہے راستہ میں اس کا عاشق جو تاک میں بیٹھا ہوا تھا موقعہ پاکر روک لیتا ہے۔ آنچل پکڑ کر محبت کا راز چھیڑ دیتا ہے۔ لڑکی باتوں میں ٹالتی ہے۔ عاشق گگرا پکڑ لیتا ہے۔ لڑکی غم و غصہ میں یہ کہتی ہے)

مہکا روکو ناہیں پن گھٹ پر جانے دو۔

کاہے کرت ہو ٹھٹول موسے ۔ ایسی ناہیں ہوں میں بھولی ۔ جانت ہوں تمری گھتیاں ۔ سگری اپنی گون کی کرت ہو بتیاں۔ چلو ہٹو آنچرا چھوڑو تو × بیر بیر موسے کرت چھیر ۔ ایسو ڈھیٹ کدر تمہیں ناہیں کا ہو کا ڈر ۔ کاہے چھینے لیت گگر یہ بھلا توڑو تو×

(والا قدر نواب وزیر مرزا لکھنوی)

بھاشا کی یہ پاک و صاف شاعری جو اپنی رومانیت سادگی اور بے تکلفی میں دُنیا کی ہر شاعری کا مقابلہ کر سکتی ہے اس حد پر آکر رک گئی ہے موجودہ زمانہ میں کچھ حضرات نے ضرور اس کی طرف توجہ کی اور ہم حفیظ جالندہری کے نہایت مشکور ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان حضرات میں کسی نے ہماری غزل میں یہ طرز پیدا کرنے کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی چند مستورات ابھی ضرور ہیں جو رسم کی پہیلی کی کڑیوں کو توڑ کر اپنے دلی جذبات کا اظہار اپنی ہی زبان اور طرز میں کرتی ہیں لیکن اس طرز کی غزلیں ہمارے ادب میں معدودے چند

ل ہی میں "آجکل" کے ایک اشاعت میں میری نظر سے ایک غزل گذری ہے جو ملاحظہ ہو۔

پی جب پوچھیں حال مرا تم دھیرے سے مسکا دینا   بس آنکھوں ہی کے اشارہ میں تم انت میرا سمجھا دینا
اس پر بھی سکھی پی حیران رہیں وہ چنتا کے مہمان رہیں   اس نین پیالہ سندر سے دو موتی بوند گرا دینا
کچھ کہنا نہ میرے مرنے کا چپ چپکے ہائے بچھڑنے کا   ایک سندر تھالی میں رکھ کر مرجھائے پھول دکھا دینا
اس پر بھی سکھی پی حیران رہیں وہ چنتا کے مہمان رہیں   ان کا پیتے ہاتھوں میں لیکر تم جلتا دیپ بجھا دینا

ہندی شاعری کے اس اظہار تعشق پر ایک عرصہ سے غیر فطری ہونیکا الزام لگایا جا رہا ہے اور میرے نزدیک دیگر ادبی مسائل کی طرح یہ گتھی بھی آج تک بحث سے نہ سلجھائی جا سکی۔ قطع نظر اس کے کہ گردھر کوی رائے۔ بہاری لال۔ کیشو داس۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ اور سینا پتی کا کلام جو ہندی عشقیہ شاعری کے ستون ہیں کبھی غیر فطری نہیں محسوس ہوا۔ اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ عورت کے پہلو میں بھی ایک دل ہے جو کبھی کبھی محبت کے تیر سے گھائل ہو سکتا ہے اور عورت کے دل میں بھی عشق و محبت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں جن کا اظہار فطری طور پر کچھ وقفوں پر ضرور کیا جا سکتا ہے۔

سر سید رضا علی صاحب نے اپنی سوانح عمری موسوم بہ "اعمال نامہ" میں صفحہ ۹۲ پر اپنے طرز خاص میں ہندی کی الٹی گنگا بہائی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"ہندی کی یہ حالت ہے کہ وہاں الٹی گنگا بہتی ہے یعنی عورت عاشق ہے اور مرد معشوق۔ محبت و عشق کی یہ ترتیب ہی قانون قدرت کے خلاف ہے میں یہ نہیں کہتا کہ پریم کی لوری کا اثر عورت کے دل میں وہ مسرت اور اسکی آنکھوں میں وہ سکون اور اطمینان کا وہ نشہ پیدا نہیں کرتا جو مرد کو حاصل ہوتا ہے مگر غور سے دیکھئے تو شرم و حیا، ہر ملک میں اور خاص طور پر ہمارے ملک میں عورت کا قدرتی زیور ہے۔ ہندوستانی عورت بلا لحاظ اس کے کہ امیر ہو یا غریب جذبات محبت ہرگز دل سے زبان تک نہیں آنے دیتی۔ وہ خاوند کے لئے جان دے دیگی مگر زبان سے کبھی یہ نہ کہیگی کہ "پیارے رام پرشاد میں تم پر مرتی ہوں"

موصوف نے ستم ظریفی تو یہ کی ہے کہ ایک برہمن کا گیت لکھ کر یہ کہا ہے بھلا کوئی غیرت دار اور شریف طبع عورت ہے کہ پیا کی یاد میں اس طرح آپے سے باہر ہو کر مست ہتنی کی طرح چنگھاڑے۔ وہ گیت بھی سن لیجیے۔

اُڑ جا دیس بدیس رے طوطے اُڑ جا دیس پردیس   میں جاؤں تجھ پر بلہاری۔ برہ کی میرے لگی کٹاری
رو رو گئے موسے گردھاری۔ چلے گئے پردیس رے طوطے اڑ جا دیس پیا   تارے گن گن رات بتاؤں دن میں پل بھر چین نہ پاؤں
آنسو بہتی رہوں غم کھاؤں۔ اڑ جا پیا دیس رے طوطے اڑ جا دیس بدیس   مل جائیں تو ان سے کہنا۔ وہ بہر ہو گیا تم بن رہنا۔
تج دیا سارا گہنا وہنا۔ جوگن کا ہے بھیس رے طوطے اڑ جا دیس بدیس   (راندر جیت شرما)

اس بات کا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں کہ یہ گیت کہاں تک غیر فطری ہو سکتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ محبت کی ماری لڑکیاں اپنی سہیلیوں سے دل کا راز کھولتی ہیں یا تنہائی کے موقعہ پر دل سے باتیں کرتی ہیں۔ اگر کسی شاعر نے اسی تخیل کو الفاظ کے لباس میں پیش کر دیا تو کیا گناہ؟ ذیل میں دو قطعات پیش کئے جاتے ہیں جو ہندی سے براہ راست ترجمہ کئے گئے ہیں۔

(۱) اس میں ایک لڑکی اپنی نوجوان سہیلی کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔

رادھا پیاری فضول باتیں نہ بناؤ
میں تمھارے راز کو خوب جانتی ہوں۔
تم کرشن کی سندرچتون کے آگے اپنا دل ہار چکی ہو — اور
باغ میں اسے محبت کا نذرانہ بھی پیش کر چکی ہو۔
آخر تم نے شرما کر اپنے منھ پر آنچل کیوں ڈال لیا
تم آدھے راستے سے چھپ کر کیوں بھاگ گئی ہو۔
سکھی کیا شرم سے محبت چھپ سکتی ہے
کیا جال میں پانی رُک سکتا ہے۔

(۲) اس قطعہ میں ایک لڑکی اپنے سوامی سے شب وصل یوں ہم کلام ہوتی ہے۔

سوامی! اتنے مست ہو کر میرے آنچل کو مت کھینچو
ٹھہرو۔ ذرا دیئے کو مندھا کر دوں!
دوڑ کر دروازہ لگا آؤں
دیکھ آؤں کوئی ہے تو نہیں — اور
ان ہنسوں اور ہرن کے بچوں کو باہر نکال دوں — پھر
میں آپ کی ہوں — پیارے سوامی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شاعری کو کس طرح غیر فطری کہا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس ہندی شاعری کو غیر فطری کہنا بیان ورنہ کی فطرت سے ناآشنائی کا اظہار ہے — الغرض اس طرح اردو غزل کی ماہیت اور اسکی شکل میں خوشگوار تبدیلی کر کے ہم اپنی شاعری کے خزانہ میں ایک نیا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ رہ گیا ہے کہ ناظرین مجھ سے کہاں تک اتفاق رائے کرتے ہیں۔

(سلطان زمان)

Mr. Z. Faiyazi (Alig.)
Editor, Guldastah, Bijnor.

برہ کی گھایا

یوں تو پوری مثنوی "پدماوت" حیات انسانی کا ایک مکمل مرقع ہے جس میں ملک محمد جائسی کے سحر نگار قلم نے زندگی کے مختلف خد و خال کی تصویروں میں وہ رنگ آمیزیاں کی ہیں کہ بے ساختہ زبان سے مرحبا نکل جاتا ہے لیکن آج کی مختصر صحبت میں میں حیات انسانی کے صرف ایک نمایاں پہلو "برہ کی گھایا" یعنی "درد محبت" کی منظر کشی کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

پدماوت کی ترتیب و تشکیل فارسی مثنویوں کے طرز پر ہوئی ہے مصنف عربی فارسی اور ہندوی ادب سے واقف تھا اور ظاہر ہے کہ ان زبانوں میں محبت کے عنوان پر کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ قصّوں، کہانیوں اور شعروں میں مختلف پیرایۂ بیان میں شعراء نے اپنے تخیل کو پیش کیا ہے۔ بالخصوص مثنوی میں بہت زور باندھا گیا ہے۔ فارسی ادب کی تمام مثنویوں کی جان حسن و عشق کی کار فرمائیاں ہیں۔

ملک محمد نے بھی اپنی تصنیف پدماوت میں درد محبت کی کسک کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ افسوس ہے کہ پدماوت کی زبان عام فہم نہیں ہے اور اسی لیے اس کے اشعار زبان زد عوام نہیں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس میں تمام شاعرانہ نزاکتیں اور لطافتیں موجود ہیں۔

محبت ایک اندرونی لگاوٹ ہے جس کا تعلق روح سے ہے اسکی صحیح عکاسی الفاظ کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی کسی نے خوب کہا ہے۔

سے۔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

ممکن ہے یہ آگ زور پکڑ کر جسم انسانی کو خاکستر بنا دے اور مزرعہ حیات کو برق دم کردے سراسر نقصان کا اندیشہ ہے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کائنات کی تمام چہل پہل اور ہما ہمی اسی کی تجلی کی رہین محبت ہے۔ یہ گرمی بازار حسن۔ یہ نظارۂ جمال۔ یہ مژدۂ وصال۔ یہ آتشی جہنم دگوش، یہ جنت نگاہ اور یہ فردوس گوش اسی ایک کسک کے باعث قائم ہیں۔ سے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

کوئی دل جلا کہہ گیا ہے۔ سے

بڑی چیز ہے یا بھلی چیز ہے؟ محبت بڑے کام کی چیز ہے

یہی وجہ ہے کہ تمام خطرات کے باوجود محبت کو قابل قدر عطیہ سمجھا گیا ہے۔ سے

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

ملک محمد نے بھی مختلف حیثیتوں سے محبت پر اپنے افکار کو ظاہر کیا ہے مگر ان سے پورے طور پر لذت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ کے ضروری اجزاء کو سمجھ لیا جائے۔

پدماوت شیر شاہ کے دور حکومت (۱۵۴۰ـــ۴۵ء) کی ایک نادر تصنیف ہے جس کی زبان اودھی ہے۔ اس میں علاؤالدین خلجی کی جاذب نظر رانی پدمنی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ پدمنی یا پدماوت سنگلدیپ کے راجہ گندھرب سین کی بیٹی تھی جس کی تعلیم و تربیت اور پرداخت میں ہیرامن طوطا بھی شریک تھا۔ طوطا اپنی صاف گوئی کے باعث شہر بدر ہوا اور چتوڑ گڈھ میں آکر رکا اور راجہ رتن سین والی چتوڑ کا ہمراز بنا۔ ایکدن راجہ کی رانی ناگمتی نے طوطے سے اپنے حسن کی داد چاہی۔ اس نے پدمنی کا نام لیکر آہ سرد کھینچی۔ شدہ شدہ راجہ کو خبر ہوئی اور وہ دیوانہ وار پدماوت سے ملاقات کے لئے روانہ ہوگیا۔ اور بالآخر بڑی جدوجہد اور کشمکش کے بعد شادی کرنے میں کامیاب ہوگیا اور داد عیش و نشاط دینے لگا۔ ادھر ناگمتی درد فراق کی ماری راہ انتظار تکتے تکتے جاں بلب ہوگئی کہ انجام کار راجہ کو واپسی کی سوجھی۔ اور پدماوت کو لاکر چتوڑ میں حکومت کرنے لگا لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ پدماوت کے حسن کا شہرہ علاؤالدین کے کانوں تک پہنچا۔ اس نے فی الفور اس گوہر نایاب کو حاصل کرنے کے لئے جنگ شروع کردی۔ راجہ نے کشت و خون سے بچنے کے خیال سے صلح کر لی۔ بادشاہ قلعہ میں مہمان ہوا اور وہیں آئینہ میں پدماوت کے چہرے کی جھلک دیکھنی نصیب ہوئی۔ واپسی پر بادشاہ نے راجہ کو گرفتار کرلیا اور دہلی لے جاکر قید کر دیا لیکن گورا اور بادل دو مشہور نبرد آزما راجپوت سرداروں نے راجہ کو چھڑا لیا اور چتوڑ گڈھ لے گئے۔

رتن سین کی قید کے زمانہ میں راجہ دیوپال والی کنبھل نیر نے جس کو رتن سین سے خصومت تھی پدماوت کے پاس کٹنی بھیجکر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر رانی کا پائے ثبات جادۂ وفا سے متزلزل نہ ہوا۔ قید سے رہائی پر رتن سین نے دیوپال پر یورش کر دی اور اس کو جان سے مار ڈالا لیکن خود بھی بری طرح زخمی ہوگیا اور جانبر نہ ہوسکا۔ مرنے سے قبل راجہ نے تمام عزیز و اقارب اور رانیوں کو جمع کیا اور بہ حسرت و یاس ان کی طرف دیکھا۔ پدماوت کا نازک دل اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لا سکا اس نے سب رانیوں کو جمع کر کے جوہر کیا اور چتا میں جلکر بھسم ہوگئی۔ ـــــ ابھی اتنا ہی ہوا تھا علاؤالدین کی فوجیں قلعہ میں داخل ہوگئیں سلطان کو اصل روداد کا علم ہو کر نہایت افسوس ہوا اور وہ بے نیل مرام واپس پھرا۔

اب محبت کی کار فرمائیاں ملاحظہ ہوں :-

جینے کے بول پڑھ کے گھسایا
جن کی باتیں محبت بھری ہوں

کتنا تو روپیہ سو کھایا تو پایا
وہاں ذرہ کا کچھ شمار ہے اور نہ حد کا

محمدؐ کب جو پریم کا، تا تنہ رکت نہ مانس
جین مکھ دیکھا سو ہنسا سنا تہیں آئی آنس

اے محمدؐ جو کلام محبت کا ہے اس کے نہ خون ہے اور نہ ماس (گوشت)
جس نے منہ دیکھا ہنسنے لگا اور جس نے کلام سنا بیساختہ آنسو نکل پڑے۔

طوطا پدماوت سے رخصت چاہتا ہے کہ اب جان کی خبر نہیں ہے۔ پدماوت اُسے دل و جان سے عزیز رکھتی ہے طوطے کی باتیں سنکر اُسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اپنے ارادہ سے باز آئیے۔

ہوں مانس توں پنکھی پیارا
میں آدمی ہوں اور تو پیارا پرندہ ہے

دھرم پریت تہاں کو مارا
جہاں محبت دھرم ہے وہاں کون مار سکتا ہے

کا پریت تن ماہیہ بلائے
کیوں محبت کو مٹا دیتا ہے دیتا ہے محبت وہی ہے

سوئی پریت جیو ساتھ جو جائے
جو جی کے ساتھ قایم رہے۔

پریت بھارے بیٹھے نہ سوچو
محبت کا بوجھ اُٹھا کر دل میں نہ سوچے

وہی پنتھ بھل ہوئے کہ موچو
وہی راستہ بہتر ہے کہ موت آجائیے۔

پریت پہار بھار جو کاندھا
محبت کے پہاڑ کا بوجھ جس نے کندھے پر لیا

کیت تیہی چھوٹ لائی جیو باندھا
پھر اس سے کیونکر چھوٹے وہ تو جی کے ساتھ ہے۔

پدماوت تالاب میں سہیلیوں سمیت نہانے جاتی ہے۔ پانی میں داخل ہوکر سہیلیاں کھیل کود میں مصروف ہوجاتی ہیں اور پدماوت سے کہتی ہیں :-

دھن سو کھیل کھیلہ رس بیہال
آفریں کھیل سے محبت کا کھیل رنج جس

روناٹی اور کھیل کہاں
خوشی و خرمی کہاں ہے۔

محمد بازی پریم کی جیوں بھاوئے تیوں کھیل
اے محمد بازی محبت کی جس طرح خوش آئے کھیل ویسی کھیل

تیل پھول پاس جیوں ہوئے پھولائل تیل
پھول کے ساتھ بس کر پھولیل تیل نکلتا ہے (اسی طرح تو بھی سنور جائیگا)

طوطا لونڈی کو چوری کی مذموم حرکت پر ڈانٹتا ہے تو لونڈی اس کی جان کی لاگو ہوجاتی ہے۔

باور رہ پریت سکر لاگو
دیوانہ اور اندھا ہو جاتا ہے جسے محبت کی لگن ہے

سو نہ وسے نہیں سوجھے آگو
سامنے چلا جاتا ہے آگے نظر نہیں آتا۔

شوہر بیوی کا پتی اور مالک ہے۔ اس کی رضا اور سیوا بیوی کا دھرم ہے۔ اس کی ناراضی حساس طبع بیوی کے دل میں آتش دوزخ کا کام کرتی ہے۔ راجہ ناگمتی سے ناراض ہوجاتا ہے۔ ناگمتی اپنی محبت اور سیوا کے بل پر چلا اٹھتی ہے لے

شوہر کے دعویٰ محبت پر شک ہونے لگتا ہے۔

پرم سہاگ نباہ نہ پارے
محبت اور سہاگ کا نباہ نہیں ہوتا۔ بلکہ

بھاگ ڈہاگ سوا جب ہارے
خدمت نہ کرنے سے عداوت ہو جاتی ہے۔

ڈنک دوش بیرچ پیو رو ٹھا
اتنی سی خطا پر پیا آپ ایسے روٹھے شوہر کو

جو پیو آپن کہے سو جھوٹھا
جو اپنا کہے۔ وہ جھوٹا ہے۔

لیکن جب اس پر بھی راجہ کی نظریں اس سے صاف نہیں ہوتیں تو رانی دایہ سے طالب مدد ہوتی ہے۔ جو بچپن کی رازدار اور تجربہ کار ہے۔ شاید وہی کوئی راہ مصالحت بنا سکے۔ ــــ آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا دیکھا۔

پُھرا پریت کنچن مہ سیسا
محبت کے سونے میں سیسہ پڑ گیا۔ جیسے

بچھرن لے سیام سیے دیسا
شوہر ایسا جدا ہو جائے گا کہ نظر بھی نہ آئے گا۔

میں اپنیو پریت بھروسے کرب کینہہ جی مانہ
میں اپنے شوہر کی محبت کے بل پر اپنے جی میں غرور کیا

تہہ رس ہوں پر بیٹھی نکر ردشش کی تانہہ
اسی غصہ میں جدا ہوتی ہوں اور شوہر بھی روٹھا جاتا ہے۔

دایہ مدد تو کیا دیتی۔ الٹی رانی کو قصوروار ٹھہراتی ہے۔

جیٹھہ رس نینہہ رس جوگ سجائی
جہاں غصہ ہے وہاں محبت کا کیا حساب بغیر رس

بن رس ہردی ہوسنہ پیرائی
کے ہلدی میں زردی پیدا ہوئی۔

جینہہ کے رس ملائے رس دیجے
جس کے غصہ میں محبت شامل ہوئی وہ جی گیا سو

سو رس تج رس کو نہ کیجے
اس رس کو چھوڑ کر غصہ کیوں کرے۔

کنت سہاگ کی پائی سادھا
شوہر کے سہاگ کا مزہ پایا۔ مزہ وہی پاتا

پاوے سوئی جو وہ چت باندھا
ہے جو شوہر کا خیال رکھتا ہے۔

رتن سین پدماوت کا حال سنکر بیقرار ہو جاتا ہے اس کا جلوہ نگاہ میں کھب جاتا ہے اور ہر طرف اسی کی صورت نظر پڑتی ہے۔ ــــ

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد — بسا کیں دولت از گفتار خیزد

تینوں لوک کھنڈ چودہ سبھی پرے موسُوجھ
تینوں لوک اور چودہ طبق سب جگہ وہی مجھے نظر آتی ہے

پریم چھاڑ کچھ اور نہیں لُنان جو دیکھا من بوجھ
سوائے محبت کے اور کوئی چیز اچھی نہیں میں نے دل میں سمجھ لیا۔

طوطا نصیحت کے عواقب سے راجہ کو آگاہ کرتا ہے کہ خبردار ایسا خیال خام بھی دل میں نہ لانا۔ یہ منزل بڑی دشوار گذار ہے

جس پر گذری ہو وہی جانے۔

پیم سنت سن بھول نہ راچا — حال محبت سن کر دل میں نہ بھول اسے راجا محبت
کٹھن پیم سر دیئے نہ چھاجا — بہت سخت ہے، سر دیئے بغیر کچھ نہیں بنتا۔

پیم پھاند جو پرا نہ چھوٹا — محبت کا پھندا جس کے پڑا وہ اس سے نہ چھوٹا۔
جیو دینچہ، وہ پھاند نہ ٹوٹا — جان دینے پر بھی وہ پھندا نہیں ٹوٹتا۔

گرگٹ چھند دھرے دکھ تپتا — گرگٹ نے عشق بازی کے جو اتنے صدمے اٹھائے
کھن کھن پیت رات کھن سینا — تو لمحہ بہ لمحہ زرد، سُرخ اور سفید ہوتا ہے۔

جان پچھار جو بیٹھئے بن باسی — یہ بھی جان لو کہ طاؤس نے جو بن باس اختیار کیا
روئیں روئیں پہ پھاندن کو آسی — روئیں روئیں پھندے پڑ گئے ہیں العوز۔

پانکھ پھیر برا سوئی پھاندہ — طاؤس کے پروں میں جو پھندے (نقش ونگار) ہیں
اُڑ نہ سکے اُرجھی بھئی باندو — اس سے نکل نہیں سکتا ایسا الجھا ہوا دام ہے۔

موبوں موبوں نِش دن چلائے — (اس لئے) رات دن مُوا مُوا کرکے چلاتا ہے اور
وہی روش ناگن دھر کھائے — اسی غصہ سے سانپ کو دھر دھر کے کھاتا ہے۔

پانڈک سوا کنٹھ وہ چینھاں — فاختہ اور طوطے کے طوق کی یہ علامت ہے کہ
جینہہ گیئں پرا چاہ جیو دینھاں — جس کے گلے میں پڑا اس نے جان دی۔

نیتر گیئں جو پھاند ہے نتیہہ پکارے دُوکھ — تیتر کے گلے میں جو پھندا ہے ہمیشہ پکارتا ہے کہ غمزدہ ہوں
شکت منہکار پھاند گیئں، میلے کنٹ مارے پن ہوکھ — زور سے پکارتا ہے کہ میرے گلے میں طوق ہوا اسلئے ہے کہ کوئی مارے تو بچا ہے

راجا اپنا بدیہی دلائل کے سامنے عقل کی سپر ڈال دیتا ہے مگر عشق خانہ خراب کے ہاتھوں مجبور ہے۔ دل پر قابو نہیں چلتا "طوطے ایسی
بھلی کٹھن باتیں نہ کر۔ مجھے تجھ سے امید وفاداری ہے۔ اور تو پہلی ہی منزل میں کندھا ڈالے دیتا ہے"

پہل پیم ہے کٹھن دوہیلا — پہلی ہی منزل محبت کی ہے سخت مشکل ہے گا۔
دو دو جگ تِرا پیم جیہہ کھیلا — دو جہاں میں اس کا بیڑا پار ہوا جس نے محبت کی بازی کی۔

دُکھ بھیتر پریم مدھورا کھا — شراب محبت کے اندر ایذائیں بہت ہیں۔ جو
کیچن مرن چہے سو چاکھا — سختی مرگ گوارا کرے وہی چکھے۔

جس نیہہ سیس ہیم پنتھ لاوا
سو پہ تھوی منہ کا ہیکو آوا

جس نے راہ محبت میں سر نہ دیا وہ زمین پر کیوں آیا۔

اب میں ہیم پاین سر میلا
پائی نہ ٹھیلن، راکھ کر چیلا

اب ہم نے محبت کے پاؤں پر سر رکھا ہے۔ سو تو ٹھوکر نہ مار۔ چیلا کر کے رکھ۔

ہیم بار، سو کھے، جو دیکھا
جین نہ دیکھ کا جانی بیکھا

جس نے دروازہ محبت کا دیکھا، وہ سوکھا جس نے نہ دیکھا وہ اس کی قدر کیا جانے۔

تب لگ دکھ، پیم نہ بیٹھا
جو سو بیٹھ، جرم دکھ بیٹھا

عاشق کو تکلیف اس وقت تک ہے جب تک محبوب کا وصل نہیں ہوتا اور جب وصل ہوا، عمر بھر کا دکھ مٹ جاتا ہے۔

طوطے کی مشفقانہ نصیحتیں بے سود گئیں ؎

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

تیر عشق دل پہ پوری طرح قبضہ کئے ہوئے ہے۔

پیم گھاؤ دکھ جان نہ کوئی
جیہہ لاگے جانے پہے سوئی

زخم محبت کی ایذا کوئی نہیں جانتا جس کے یہ زخم لگتا ہے وہی جانتا ہے۔

پرا سو پیم سمندر اپارا
لہر نہ لہر ہوئے بسبارا

راجہ دریائے محبت ناپیدا کنار میں پڑ گیا بار بار بے صبر اور بے حال ہوتا تھا۔

برہ بھنور ہوئے بھانور دیئے
کھن کھن جیو ہلورا لیئے

عشق گرداب ہو کر گردش دینے لگا لحظہ بہ لحظہ دل بیقرار اور بیتاب ہوتا تھا۔

کھنہ نسانس بوڈ جیو جائی
کھنہ او ٹھی نسانس بورائی

لحظہ میں بیدم ہو کے جی ڈوب جاتا اور لحظہ میں بیتابی سے دیوانہ ہو جاتا۔

کھنہ پیت کھن ہو مکھ ستیا
کھنہ چیت کھن ہوئی اچنتیا

کبھی منہ زرد اور کبھی سفید ہو جاتا۔ کبھی ہوش میں اور کبھی بے ہوش ہو جاتا۔

کٹھن مرن تیں پیم بوستھا
نان جیئے نہ جانے اوستھا

دکھ محبت کا مرنے سے زیادہ تکلیف دہ ہے آدمی نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے ادھر میں لٹکتا ہے۔

جنہ لے بار فہہ لینہہ جیو، ہر نہ تماسنہ تاہ — جس نے بغیر دیکھے جان لے لی وہی یہ تشنگی رفع کر سکتا ہے
اتنا بول نہ آوَ، مکھ کرے تراہ تراہ — مارے پیاس کے آواز مُنہ سے نہیں نکلتی تراہ تراہ کرتا ہے

آتشِ عشق کی گرمی۔ معاذ اللہ، سب تیور بھول گئے ہوش و حواس غائب ہوئے غشی و مدہوشی طاری ہوئی حال سے بے حال ہوگیا۔ ع

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب

جو بھا چیت اُٹھا بیرا گاہ — جس وقت ہوش آتا اور جوش کم ہوتا (یہ معلوم ہوتا)
باورہ جنو سوت اودھیہ جاگا — کہ کوئی دیوانہ نیند سے جاگا ہے۔
آوت جگ بالک جس رووا — جس طرح پیدا ہوتے وقت بچہ روتا ہے۔
اوبھا روی ہاگیان سوکھووا — اسی طرح راجہ رو اٹھتا ہے نا سمجھی سے۔
ہوں تو اہا امر پُر جہاں — میں تو امر پور (ملک بقا) میں تھا۔ یہاں
اہاں مَرَن پور آیوں کہاں — ملک فانی میں کیوں آیا۔
کیَن اُپکار مَرَن کر کینہاں — کس نے کوشش میرے مرنے کے واسطے کی ہے
سُکت جگائے جیو ہر لینہاں — کہ عالم خاموشی سے جگا کر میرا جی لے لیا۔
سووَت آہا جہاں سکھ ساکھا — جس طرح سے میں سکھ چین سے سوتا تھا۔ اُس طرح
کس نہ تہاں سووت بدھی راکھا — کا میرا ہونا خدا کو پسند نہ ہوا۔
اب جیو تہاں، اہیاں تن سُوناں — اب جان وہاں ہے اور قالب یہاں سو کب تک
کب لگ رہ یہی پہران بہُو ناں — بغیر جان کے جسم رہ سکتا ہے۔
جو جیو گھٹے کال کی ہاتھاں — درحالیکہ جان موت کے ہاتھ میں ہے اس رنج و
کٹھن نیک ہے ہیون ساتھاں — غم سے تو یہ بہتر ہے کہ جان ہی اس کے پاس چلی جائے۔
اودھشہ ہا تھہ تین سَر در، ہیا کنول تہ ماتھہ — تن مثل تالاب کے ہو اور دل مثل کنول کے اور ہاتھ میں طاقت اُٹھنے
نَینہہ جانوں نیریں، کرپہنچیت آو گا نہ — کی ہو اور آنکھوں کے قریب ہو لیکن دسترس اس تک مشکل ہے۔

عزیز و اقارب راجہ کو سمجھاتے ہیں اور محبت کی پرپیچ وادیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

اُدھو نیہ کا ہو سوں کیجے — محبت کسی کے ساتھ کرنی اچھی نہیں۔ نام تو شیریں
ناؤں میٹھ کھائی جیو دیجے — ہے لیکن جو کھائے وہ جان دے۔

پہلنہہ سکھ نیہہ عجب جو را — پہلے پہل تو محبت کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

پچّن ہوئے کٹھن نباہت اورا — پھر نباہنا اس کا سخت مشکل ہوتا ہے۔

گگن درشٹ موں جائے پہنچا — آسمان تک نگاہ بے تکلف پہنچ سکتی ہے۔ لیکن

پیم آدرشٹ گگن تیں اونچا — محبت تک نہیں پہنچ سکتی کہ وہ آسمان سے بھی بلند ہے۔

دُھو تیں اوپچ پیم دھو اُدا — محبت کا قطب، قطب آسمان سے بلند طالع ہوا ہے

مہر دسے پاؤں دیئے سو چھوا — جب تک سر نہ دے محض پاؤں سے کون چھو سکے۔

تم راجہ او سکھیا کرو راج سکھ بھوگ — تم راجہ اور نازپروردہ ہو تم نے چین سے راج کیا ہے

یہ رس پنتھ سو پہنچے جیہہ سہے جو دکھ بیوگ — اس راہ میں وہ گذر کرے جو درد عشق کے صدمہ سہہ سکے۔

لیکن یہاں ع شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آتش شوق اور بھڑک اُٹھی

او بچین پیم پیر جیہہ آئے — جس شخص کے دل میں درد محبت پیدا ہوتا ہے نصیحت

پہ بوڈھنت ہو آدھک سو آئے — اور ملامت سے اور زیادہ بڑھتا ہے۔

امرت بات کہت بکھ جاناں — اچھی بات عاشق سے کہو تو وہ زہر جانتا ہے۔

پیم کو بکن میٹھ کے ماناں — اور محبت کی بات شیریں معلوم ہوتی ہے۔

جو وہ بکھی مار کے کھائے — جس شخص نے زہر محبت کا کھایا ہے اسی سے

پوچھو تا ہی پیم مٹھائے — محبت کی شیرینی کا حال پوچھنا چاہئے۔

پوچھو بات بھرتری جائے — محبت کی بات بھرتری سے جا کر پوچھو جس نے

امرت راج تجو بکھ کھائے — عیش کی حکومت چھوڑ کر زہر محبت کھایا۔

او مہیش بڑے سدھ کہاوا — اور مہا دیو بڑے کامل مشہور تھے اُنھوں

اُنہوں بکھی کنٹھ سپے لاوا — نے بھی زہر محبت کا نوش کیا۔

بجز وصل یار چارہ نہیں ہے۔ جان رہے یا جائے۔ وادی دیار یار ہیں قیس آسا سر پھوڑتا ہجر کی گراں جانی سے بہتر ہے۔ دوست احباب نیک ساعت کی فکر میں ہیں مگر راجہ کہتا ہے۔

پیم پنتھ دن گھری نہ دیکھا — محبت کی راہ میں دن گھڑی نہ دیکھنی چاہیئے۔ یہ

تب دیکھی جب ہوئے سرکھا — جب دیکھے، جب عقل ٹھکانے ہو۔

جینٹہ تن ہیم کہاں تینٹہ مانسو
جس کے بدن میں محبت ہے وہاں گوشت کہاں

کایا رکت نہ نینہ آنسو
اور جس کے جسم میں خون نہیں وہاں آنسو کا کیا دخل۔

جیہ کے ہیئے ہیم رنگ جاماں
جس کے دل میں محبت کا رنگ جما ہے اس کو

کا تینہ نیند بھونکہ بسراماں
سونے کھانے اور آرام سے کیا کام۔

بھنور جان پے کنول پر بیتی
بھونرے ہی کو کنول کی محبت کی قدر ہے۔

جینٹہ مہ بتھا ہیم گئی بیتی
جس میں درد محبت ہے وہ گذر گیا۔

او جیں سمند ہیم کر دیکھا
جس شخص نے دریائے محبت کو دیکھا ہے اسکے

تینٹہ یہ سمندر بوند بر لیکھا
آگے یہ سمندر بوند برابر ہے۔

جو پی جیو باندہ ست بیرا
جس شخص نے محبت کی راستی اپنے دل پر اختیار کی

پر جیو جائی پھرے نہ پھیرا
اگرچہ جان جاتی رہے وہ منہ نہیں پھیرتا۔

ہیم سمندر ایس اوگاہا
محبت کا دریا ایسا عمیق ہے۔ جس کا وار

جہاں نہ وار نہ پار نہ تھاہا
ہے نہ پار اور نہ تھاہ ہے۔

جو وہ سمند اگاہ منجہ پرے
جو اس سمندر میں پڑے۔ اگرچہ کیسا ہی گہرا

جو اوگاہ ہنس ہوئی ترے
ہو ہنس کی طرح تیر جائے۔ —

سرگ سیس دھر دھرتی ہیا سو ہیم سمند
سر میرا آسمان اور بدن زمین اور دل دریائے عشق ہو

نین کوڈیا ہوی رہی لے لے اوٹھنہ سو بند
اور آنکھیں کوڈیا جا نور ہو کے قطرہ لے لے اٹھتی ہیں۔

میں اطوار رفتہ گرفتار پنجۂ محبت ہوں۔ مجھے عقل و دانش سے کیا سروکار ع ہو وہ لطمہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

جیہں باورہ نہ بجھا ہیں بوجھا
جس طرح دیوانہ سمجھانے سے نہیں بوجھتا

کون بھا نہیں جائی گا سوجھا
اسی طرح عاشق کسی طرح نہیں سمجھتا۔

نہچیں چلا اکھہ سرم ڈر کھوئے
یقین کر کے خوف ترک کر روانہ ہوا تھا۔ جہاں

بیا ہیں چہاں سدہ نہاں ہوئے
دلاوری سے کام ہوتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔

چڑھا بیگ او بوہت بہیلی
جلد سوار ہو کے کشتی ہانکی۔ نہ سہے وہ مرد

دمن دیسے پڑکہ ہیم بنتہ کھیلی
جو راہ محبت طے کر گیا۔

پیم پنتھ جو پہنچے پارا — راہِ محبت جو طے کر گیا، پھر واپس نہیں
پُرَ نہ آئی سلے یو چھارا — ہوتا خاک میں مل جاتا ہے۔

تنہہ پاوا او تم کیلا سو — اس نے عشق کی بدولت بہشت پائی۔ وہاں
جہاں نہ تیچ، سدا سکھ باسو — موت نہیں ہمیشہ عیش و آرام ہے۔

محبت کی رفعتوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ صد دنیوی عیش و آرام اسکی ایک لذت زخم کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

۵ — عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

جینہہ جیے پیم چندن تہ آگے — جس کے دل میں محبت ہے اسکے آگے آگ صندل ہے
پیم بھون پھر ڈر نہ بھاگے — وہ مقام محبت سے ڈر کر نہ بھاگے گا۔

پیم کی آگ جرے جو کوئی — محبت کی آگ میں جو شخص جلے اُس کا رنج کبھی
تا کر دکھ نہ اِبرَ ہتا ہوئی — ضائع نہ ہوگا۔

جو جانی ست تہپنہ جارا — جو راستی کی قدر جانتا ہے آپ کو جلاتا ہے اور جو دل کا
نا ست ہنیں ست کہے نہ پارا — صادق نہیں، صدق ظاہر اُسسے پار نہیں کرتا۔

دَودھ سمند پُن پار بھیئے، پیم کہاں سنبھار — دہی کا سمندر بھی پار کیا، مگر محبت کی بیقراری کہاں برداشت ہوتی ہے
بھاوی پانی سر پڑھے، بھاوی مینہ انگار — خواہ سر پہ پانی پڑے خواہ انگارے، عاشق کو دونوں برابر ہیں۔

صحیح کہ غم مفارقت کی سہار بہت گراں ہے مگر اس کی لذتیں بھی بے پایاں ہیں۔

جہ سو برہ یہ آگ نہ ڈیٹھے — جو مجبور ہوتا ہے وہ آگ پر نظر نہیں کرتا
سو نہہ جرے پھر دینہہ نہ پیٹھے — سامنے ہو کر جل جاتا ہے پیٹھ نہیں موڑتا۔

جگ میں کٹھن کھرگ کی دھارا — زمانہ میں تلوار کی دھار تیزی میں مشہور ہے
تینہہ تیں آدھک برہ کی جھارا — مگر ہجر کی آگ اس سے بھی تیز ہے۔

برہ ہن دگدھ کینہہ تن بھاٹھے — آتش ہجر نے بدن کو بھٹی بنا دیا۔ اور ہڈیاں
ہاڑ جرا سے دینھو جیں کاٹھے — مثل لکڑی کے جلا دیں۔

نَین نیر سوں پوتی کیا — آنسوؤں سے اپنے جسم کو لیپا پوتا۔ قطرہ
کُس مدھو چووی جَس دِیا — شراب جیسا ٹپکتا، چراغ جیسا جلتا۔

برہ شرا گیں بھوبخی مانسو	شراب ہجر نے بدن کو کباب کر دیا۔ اور خون کے
گرگر پڑے رکت کی آنسو	آنسو گرنے لگے۔
محمدؐ مدہ جو پریم کا پیے دیپ تینہ راکھ	اے محمدؐ شراب محبت کا چراغ اپنے دل میں روشن کر
میس نہ دیئی پتنگ جیوں تب لگ جا ئی نہ چاکھ	کیونکہ مثل پروانہ کے اپنا سر نہیں دے سکتا جب تک اپنے تئیں فدا نہ کرے

بہزار دقت و پریشانی سنگلدیپ میں وارد ہوتا ہے اور جوگی بن کر دیوتا کی تعریف کرکے طالب مقصود ہوتا ہے۔ منڈپ سے صدا آتی ہے۔

مانس پیم بھیو بیکنٹھی	آدمی اس کی محبت میں بہشتی ہوا۔ ورنہ ایک
نا ہنت کا ہی چھار ایک موٹھی	مشتِ خاک کی کیا حقیقت ہے۔
پیم مانہ برہ رس رسا	محبت ہی میں مزہ وصل و فصل کا حاصل ہے۔
می کے گھر مدہ امرت بسا	خانہ زنبور میں مزہ شراب و شہد کا بسا۔
نستی دھا ی مرے تو کا ہا	بد راہی کرکے اگر مرگیا تو کیا۔ جو راستی پر قائم
ست جو کیسے ہوئے تنہ لا ہا	رہا وہ لائق حضوری ہوتا ہے۔

پدماوت بسنت پوجنے منڈپ جاتی ہے۔ جوگی کی صورت دیکھ کر اس کا بھولا بھالا دل تیر عشق سے گھایل ہو جاتا ہے۔ اُٹھتے شباب کے جذبات کس طرح پریشانی کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ دایہ سے کہتی ہے۔

ع مرا شوریست اندر دل کہ در گفتن نمی آید۔ دایہ استعجاب سے کہتی ہے۔

میں جانا جوبن رس بھوگو	میں سمجھتی تھی کہ جوانی بڑے مزہ کی چیز ہے۔ اب
جوبن کٹھن سنتاپ بیوگو	معلوم ہوا کہ جوانی سخت ایذا دیتی ہے حالت فراق میں۔
جوبن گرو سمیر پہارو	جوانی گراں مثل سمیر پہاڑ کے ہے۔ جوانی
سہی نہ جائے جوبن کر بھارو	کا بوجھ اٹھانا سخت مشکل ہے۔
جوبن آس منت نہ کوئی	جوانی کے برابر مستی کسی میں نہیں۔ اگر جوانی انکس ہو کر
ہوئے مہنت جو آنکس ہوئی	ہاتھی پر بیٹھے تو وہ بھی جھک جائے۔
جوبن بھر بھادوں جس گنگا	جوانی بھادوں کی گنگا جیسی ہے۔ اس قدر لہریں
لہریں دیئی سمائے نہ انگا	لیتی ہے کہ جسم میں نہیں سماتی۔

پدماوت کا جواب ملاحظہ ہو:-

ہوں اتھاہ دھای ہوں جوبن سلل گنبھیر
لے دایہ میں اتھاہ دریا میں پڑی ہوں گرداب جوانی سخت گہرا ہے

تہ چت دون چارہ دش کوگہ لاوے تیر
اس لئے ہر چہار طرف دیکھتی ہوں کہ کون کنارے پہنچائے۔

دہت دھای جوبن او جیو
لے دایہ تیری ان باتوں سے جان اور جوانی جلتی ہیں۔

جانہ پرا آگن منہ گھیو
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ میں گھی ڈال دیا ہے۔

کروت سہوں ہوں دوی آدھا
آرے کی تراش سہ سکتی ہوں کہ دو ٹکڑے کر دیتا ہے

سہی نہ جائے برہ کی وادھا
مگر سوز مفارقت برداشت نہیں ہوسکتا۔

جوبن بنکھی برہ بیا ذہو
جوبن پرندہ اور ہجر صیاد ہے۔ جو شیر

کیہر بھیو کرنگن کھا دھو
بن کے آہوؤں کو کھاتا ہے۔

جوبن چند اداہیں برہ بھیو سنگ راہ
جوانی میری مثل چاند طالع ہوئی، مگر ہجر کا خوف اسکو لگ گیا۔

گھٹنہ گھٹت کھین بھئی کہی نہ پاروں کاہ
کم ہوتے ہوتے لاغر ہوگیا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔

دایہ کی باتوں سے سوزش عشق اور تیز ہوتی ہے لیکن عصمت و عفت کا خیال بھی دامنگیر ہے ؎

حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکلجانے میں ہے

روم روم جنو لاگی چانٹی
ہر بال بدن کا مثل چونٹی کے کاٹتا ہے۔

سوت سوت جنو بیدھی کانٹی
اور ہر مسام میں کانٹے چبھتے ہیں۔

دگدھ کراہ جرے جس گھیو
گرم کڑاؤ میں جیسے گھی جلتا ہو ویسے ہی جلتا ہے۔

بیگ نہ آؤ ملیگر پیو
مگر محبوب جو مثل سندل ہے اب تک نہیں آیا۔

گپت جو پھول سانس پرگٹے
دل میں پوشیدہ سانس کی راہ سے ظہور کرتا ہے

اب ہوئی ستبھ چھپے ہم گٹے
ہر رگ و پے میں بھرا ہوا ہے کہیں کا ہیندہ ہوں۔

بھئی سنجوگ جیسرا اس مرنال
ملاقات کا لطف ایسے وقت مرنے کے ہے

بھوک ہی گئی بھوگ کا کرنال
اور جب بھوک جاتی رہی تو کھانا کس کام کا۔

جوبن چنچل ڈیٹھ ہے، کرے نکاج کاج
جوانی بڑی شوخ و بیباک ہے کام والیکا کام نہیں ہونے دیتی

دھن کلونت جو کل دھرے، کی جوبن من لاج
بڑی صاحب عصمت وہ عورت ہے جو جوانی میں اپنی لاج بچا رکھے۔

وصل کی راتوں میں درد ہجر کی جراحتوں سے سوا مزہ ملتا ہے۔

بچھڑنتا جب بھینٹے، سو جانے جیہ نہیں
سکھ تھیلا انگو سے، دُکھ جھڑے جی مینہہ

ہجور جب ملاقات کرتا ہو اس مزیکو صاحب محبت ہی جانتا ہو
عیش و عشرت پیدا ہوتی ہے اور دُکھ مثل آب باراں جھڑ جاتا ہو

کیا معلوم کسنے یہ آگ روشن کی ہے؟ ؎

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا

برہ بجا آگ بیج گا کوئی
آگ جو چھوے، جائی جر سوئی

آتشِ ہجر کا تخم کوئی بو گیا ہے۔ آگ کو جو
چھوتا ہے جل جاتا ہے۔

آگ بجھائے دھوئے جل گاڈھی
وہ نہ بجھائے آگ آتی بھاڈھی

آگ کیسی ہی تیز ہو پانی سے بجھ جاتی ہے
مگر وہ آتش (فراق) فرو نہیں ہو سکتی بلکہ دو بالا ہوتی ہے

برہ کی آگ سور جبر کیا
راتہنہ دِوَس جرے اوتپا

آتش ہاجرت سے آفتاب جل رہا ہے۔
رات دن جلتا اور تپتا ہے۔

کھنہ سرگ کھن جائے پتارا
کفر نہ ہے یہ آگ اپارا

اسی لئے کبھی آسمان پر جاتا ہے اور کبھی تحت الثریٰ میں
یہ وہ آگ ہے کہ جس کا کنارا نہیں ملتا۔

دھن سو جیو ذکر رہ ایم سہا
ابیں جرے دوسر نہیں کہا

زہے وہ شخص جس نے یہ آگ گوارا کی، باوجودیکہ
جلتا ہے مگر دوسری بات نہیں کہتا۔

سلگ سلگ بھتیر ہوئے شیامال
پرگٹ ہوئی نہ کاڈھے ناماں

فراق یار میں جل جل کے دل سیاہ ہو جاتا ہے
لیکن ظاہر میں (ریادب) اس کا نام زبان پر نہیں لاتا۔

کاہ کہوں ادہی سوں جیں دکھ کینھہ نہ میٹ
تنہ دن آگ کروں یہ باہر جینہہ دن ہوئے سو بھینٹ

اس کو میں کیا کہوں جس نے میرا رنج دل زائل نہ کیا
اس دن البتہ یہ آگ نکلے گی جب اس سے ملاقات ہوگی۔

گرمی آتش عشق اسے معاذاللہ ؎
آتشکدہ ہے سینہ مرا سوز نہاں سے

جینہہ سر آگے ہوئی ہوی لاگی
سب تن داگ سنگھ بن داگی

جس کے سر میں آتش فراق لگتی ہے سارا بدن
داغدار مثل شیر صحرائی کے ہو جاتا ہے۔

جرے مرگ بن کھنڈ تنہ جوالا
آہوئے صحرائی بھی اسی شعلہ سے جل جاتا ہے

اوتی جرے بیٹھی تینہہ چھالا
اور وہ شخص جل جاتا ہے جو اس کی کھال پر بیٹھتا ہے۔

برہ اگن بجرانگ اشو بھا
عشق کی آگ سخت اسی وجہ سے ہے۔ اس میں

جرے سور نہ بجھائی بوجھا
بہادر ہی جلتا ہے کہ پھر بجھائے سے نہیں بجھتا۔

تیہ کی جوت جو اُٹھی بجھاگی
اس کے جلنے سے جو شعلے اُٹھتے ہیں۔ اُن سے

تینوں لوک جر نہ تیہہ لاگی
تینوں لوک جلنے لگتے ہیں۔

محمدؐ چنگ پریم کی سُن انہی گگن ڈرای
اے محمد چنگاری محبت کی تیزی کا حال سنکر زمین آسمان ڈرتے

دھن برہن او دھن ہیا جنہہ یہ آگ سمائے
ہیں۔ زہے وہ عاشق اور زہے وہ دل جس میں آگ سمائی ہے

اِدھر عالم بیقراری میں راجہ اُڑ کر منزل یار تک پہنچنا چاہتا ہے۔ مگر ہوائی جہاز نہیں کہ پہنچ سکے۔ ریڈیو نہیں کہ پیغام بھیج سکے۔

پنکھ ناکایا پَون نہ پایا
جسم میں پر اور پاؤں میں قوت نہیں کس طرح

کیہہ بدھ ملوں تہوّں سنکہہ چھایا
ملوں اور کیسے پہنچوں وہاں تک۔

بالآخر طوطے کو پیغام بر بنایا کہ وہ واقف اسرار وراہ حبیب ہے۔ خط میں داستان رنج وغم مرقوم کی۔

پری جو آنسو رکت کی ٹوٹی
سُرخ سُرخ آنسو جو آنکھوں سے گرے تو یہ معلوم

رینگ چلے جوں بیر بہوٹی
ہوا کہ بیر بہوٹیاں چلی جاتی ہیں۔

اوہی رکت لکھ دینہہ پاتی
اس خون سے خط لکھکر طوطے کو دیا۔ جونہی

سُوا جو لینہہ چونچ بھئی راتی
چونچ میں لیا، چونچ بھی سُرخ ہوگئی۔

باندھی کنٹھ پرا جبّں کانٹھا
گردن میں باندھا تو حلقہ پڑ گیا۔ عشق کا جیسلا

برہا جرا جائی کینہہ کانٹھا
ہوا داغ مٹائے سے نہیں مٹتا۔

مَسں نینان لکھنی برونی رو رو لکھا اکتھ
سیاہی چشم اور قلم مژگاں سے رو رو کے اپنی حقیقت لکھی

آکھر دہو نہ کوئی چھوئے، سو دینہہ پنچھی ہاتھ
حرف ایسے جلتے تھے کہ کوئی چھو نہ سکے، وہ خط طوطے کو دیا۔

جتے دکھ بان لکھوں کیہہ تا ہیں
اُن زہر آلود تیروں کا حال کہاں تک لکھوں

رکت جو چوا بھیج دہن پاہیں
وشک سُرخ جو گرے سارا زمانہ تر ہوگیا۔

جان سُکاری رکت پپیُو د	گویا کالے سانپ ہیں جو اشک خونیں ٹپکتا ہے۔
سُکھی نہ جان دُکھی کر بھیُو د	تندرست بیمار کا راز کبھی نہیں جان سکتا۔
جن نہ پیر تن کا کر چنتا	جسے کچھ درد نہیں اسے کیا اندیشہ ہے۔
پریتم نِٹھر ہوئے اس ایلتا	معشوق ہمیشہ سے بیدرد ہوتے آئے ہیں۔
کا سُوں کہوں برہ کی بھاکا	کس سے کہوں ہجر کی بات جس سے کہوں
جا سوں کہوں ہوئی جر راکھا	وہ جل کے راکھ ہو جائے گا۔
برہ آگ تن جر ہیں جرے	عشق کی آگ میں عمر بھر جلا کرے۔ آنکھوں کے
نین نیر سائر سب بھرے	پانی سے سب تالاب بھر گئے۔
پاتی لکھی سنُور تُمہ ناماں	خط لکھا تمھارا نام یاد کرکے لہو سے حرف لکھے۔
رکت لکھے آکھر بھئے سیاماں	سیاہ ہو گئے۔
آکھر جرہیتہ نہ کوئی چھُوا	حرف ایسے جلتے تھے کہ کوئی چھو نہیں سکتا تھا
تب دُکھ دیکھ چلا لے سُوا	تب یہ دکھ دیکھ کے طوطا لے چلا۔

جذبہ رشک و حسد عشق کا حاوی ہے خالی خط محبوب کے ہاتھ میں جائے اور بوسہ گیر ہو اور بدنصیب کاتب یونہی تڑپتا رہ جائے یہ کیسے برداشت ہو سکتا ہے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے	خط اُسے دیکھے بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
اَب نِشٹھ مَروں جھُونجھ گئی پاتی پیم پیاری ہاتھ	اب یہ مقام مرجانے کا ہے کہ خالی خط معشوق کے ہاتھ میں
بھینٹ ہوت دُکھ روی سُناوت جیو جات جو ساتھ	جاتا ہے۔ ملاقات ہوتی تو سارا دکھ رو کے سناتا اور جان اُسکے ساتھ کرتا

خط کیا پہونچا گویا بارود میں چنگاری پڑ گئی۔ ؎

کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا	حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
تب لگ سُکھ بیئے پیم نہ جاناں	اس وقت تک آرام ہے جب تک محبت نہیں ہوتی
جہاں پریم کا سُکھ بسراماں	جب محبت ہوئی تو آرام فراموش ہوا۔
اگر چندن نِشٹھ دہے شریر و	اگر و صندل حالت محبت میں جسم کو زیادہ جلاتا ہے
اَو بھا آگن کیا کر چیر و	اور لباس جسم کا آگ کا کام کرتا ہے۔

برہا کٹھن کال کی کلا — ہجر سخت ہے بصورت مرگ
برہ نہ سہی کال پر بھلا — ہجر سے تو موت ہی بہتر ہے
کال کا ڈھے جیو سدھارے — موت میں تو فرشتہ جان لے کر چلا جاتا ہے
برہ کال مارے پر مارے — مگر ہجر کی موت ضرب پر ضرب لگاتی ہے۔
برہ آگ پر میلے آگی — ہجر آگ میں آگ لگاتا ہے۔
برہ گھاؤ پر گھاؤ بجاگی — ہجر گھاؤ پر گھاؤ دیتا ہے۔
برہ بان پر بان پسارا — ہجر تیر پر تیر مارتا ہے
برہ روگ پر روگ سنچارا — ہجر بیماری پر بیماری پیدا کرتا ہے
برہ سال پر سال نویلا — ہجر سوراخ پر سوراخ نیا کرتا ہے
برہ کال پر کال دُہیلا — ہجر موت پر موت سخت ڈالتا ہے۔

پدماوت کی بیقراری اور اضطراب ملاحظہ ہو۔ آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں + سوز تمہارے منافی اور سوختہ

پیری دگدھ بہت اُتم مرتیجے — اس سوزش فراق سے مرجانا بہتر ہے۔ یہ سوزش
دگدھ نہ سہی جیو پر دیجے — سہی نہیں جاتی اس سے تو جان دینا اچھا ہے۔
پریت بیل جن اُرجھے کوئی — محبت کی بیل میں خدا نہ کرے کہ کوئی الجھے۔ کیونکہ
ارجھا موئے نہ چھوٹے سوئی — جو الجھا وہ بعد مرگ ہی چھوٹا۔
پریت بیل ایسیں تن ڈاڑھا — محبت کی بیل اپنا بدن کو جلاتی ہے۔ پہلے تو آرام
پلہت سکھ باڑھت دکھ باڑھا — معلوم ہوتا ہے پھر اس کی ترقی سے رنج بڑھتا ہے۔
پریت بیل کی امر کو ہوی — محبت کی بیل یہی زندہ جاوید بوئی گئی ہے کہ دن
دن دن بڑھے کھین نہ ہوئی — دن بڑھتی ہے کم نہیں ہوتی۔
پریت بیل سنگ برہ اپارا — محبت کی بیل کے ساتھ فراق لازمی ہے۔ آسمان
سرگ پتار جرے تیہی جھارا — سے تحت الثریٰ تک اس کے شعلے سے جلتا ہے۔
پریت اکیل بیل جنہ چھاوا — محبت کی اکیلی بیل جس پر چھا جاتی ہے دوسری
دوسر بیل نہ سنچر پاوا — بیل اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

پریت بیل ارجھئی جب تب سو جان سکھ ساکھ
ملی پریتم آئے کے، واکہ بیل رس چاکھ

محبت کی بیل ہے جب کوئی الجھ جاتا ہے اسکو آرام کا کام نہیں رہتا جب محبوب سے وصل ہوتا ہے تو انگور کے رس کی لذت حاصل ہوتی ہے۔

بالآخر رنج و غم کی یہ جانسوز گھڑیاں بیت گئیں۔ فرحت و شادمانی نے منہ دکھایا اور رتن سین پدماوت سے جا ملا۔ ملاقات ہونے پر راجہ اپنی داستان عشق پدماوت کو سناتا ہے۔

ہاڑ چون بھئی برہ تن دہی
جانے سوئی جو دگدھ ام سہی

ہڈیاں چونا ہوگئیں آتش فراق میں جل کر۔ سو یہ حال وہ جانے جو یہ سوز برداشت کرے۔

کے سو جان مُہو پیرا، جیہہ دکھ ایسن سر پر
رکت پیاسے جے آہیں کا جانے پَر پیر

یا وہ جانے جو درد عشق سے خبردار ہو اور جسکے دل کو ایذا پہنچی ہو۔ اور جو خون کے پیاسے ہوں وہ غیر کے درد کا حال کیا جانیں۔

سُن دھن پیم سُرا کے پیئے
مَرن جیون ڈر رہی نہ ہیئے

سُن پدماوت جو شراب محبت پیتا ہے مرنے جینے کا ڈر اس کے دل میں نہیں رہتا۔

جہاں مدھو تہاں کہاں نستارا
کی سو گھمر ہا کی متوارا

جہاں شراب ہے وہاں پھر قرار کہاں۔ کیسا بدحال ہوا اور کیا مست ہو۔

سو پی جان پیئے جو کوئی
پی نہ اگھائی جائی پر سوئی

اسے پی یہ بھی جان لو کہ جو کوئی اسے پیئے اُسے آسودگی نہیں ہوسکتی سو جاتا ہے۔

جاکنہ ہوئی بار اک لاہا
رہی نہ وہ بن اوہی چاہا

جس کو ایک بار مزا شراب کا پڑا۔ اس کے بغیر قرار نہیں پکڑتا۔ اُسی کو چاہتا ہے۔

اَرَب دَرَب سب دینی بہائے
کی سب جاؤ نہ جائی پیائے

کروروں روپیہ اسی شراب میں برباد کیا۔ یہ گوارا کہ سب چلا جائے۔ مگر شراب پینی نہ چھوٹے۔

راتہہ دِوَس رہی سب بھیجا
لابھ نہ دیکھ نہ دیکھی چھیجا

رات دن شراب ہی میں آلودہ رہتا ہے۔ نہ اپنا نفع دیکھتا ہے اور نہ نقصان۔

بھور ہوت تب پَلہہ سریرو
پائی گھمر ہا سیتل نیرو

صبح ہوتے کچھ جسم میں تازگی آئی نشہ نہیں جاتا آب سرد بھی پیا۔

ایکبار بھر دیہو پیالا، بار بار کو مانگ
محمد کم نہ پکارسے، ایس داؤ جیہہ کھانگ

ایکبار بھر یہ پیالہ بھر دے بار بار کون مانگے۔ اے محمد کیوں نہ پکارئے ایسی جگہ جہاں کمی نہ ہو۔

دوسرا رخ

راجہ کا شانۂ الفت میں گلچین بستانسرائے پدماوت ہوا۔ طوفان عشق کے جھکولوں سے محفوظ، باد و باراں کی زحمتوں سے مصئون سبکسار ساحل بنا۔ اُسے کشتیٔ شکستۂ بحر مواج ناگمتی کی کیا خبر۔ سردی پہنچی دل ٹھٹھر گیا۔ گرمی آئی دل مُرجھا گیا اور اب ساون کا ہیجان انگیز مہینہ آگیا۔ ہجولیاں اپنے اپنے شوہروں کے ہمراہ ہنڈولے جھول رہی ہیں مگر ناگمتی فراق شوہر میں بھنتی ہے۔ بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آتے اور گرج گرج کر برستے ہیں۔ چپے چپے سے آثار حیات پیدا ہیں مگر ناگمتی کیا جانے زندگی کیا ہے اُس کی شب فراق کی سحر ہی نہیں سہ

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشگال ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

سکھن رچا پیئے سنگ ہنڈولا	سکھیوں نے اپنے اپنے شوہر کے ساتھ ہنڈولا رچا۔
ہریر بھومی کسمبھی چولا	زمین سرسبز ہے اور کسمبی رنگ کے جھرمٹ پہنے ہیں۔
ہیئے ہنڈول جس ڈولے مورا	میرا دل ہنڈولے کی طرح ہل رہا ہے۔ اور
برہ جھلا دے دیئی جھکورا	فراق مجھے پینگ دیکے جھلا رہا ہے۔
باٹ اُسوجھ اتھاہ گنبھیری	راہ نہیں سوجھتی ناپیدا کنار ہے جیسا
جیو باور بھا پھرے بھنبھیری	دل دیوانہ بھنبھیری کی طرح پھرتا ہے۔
اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گذری	دوست جو ساتھ مرے تا لب ساحل آئے
جگ جل بوڑ جہاں لگ تاکی	سارا عالم پانی میں ڈوب گیا جہاں تک دیکھو میری
مورناؤ کھیوک بن تھاکی	ناؤ بغیر ملاح کے ڈوبی جاتی ہے۔
پربت سمند اگم بن، او بیہڑ گھن ڈھنکہ	پہاڑ اور جنگل میں سمندر بھرا ہے اور بیہڑ میں گھنا ڈھاک ہے
کمکر بھینٹوں کنت تم، ناموں پاؤ نہ پنکھ	کس طرح ملاقات کروں تم سے اے شوہر نہ میرے پاؤں ہیں نہ پر
برہ ہتنت تن شالی، گھائے کرے نیت چور	ہاتھی فراق کا بدن چھید ڈالتا ہے اور اسکا زخم ریزہ ریزہ کئے دیتا ہے۔
آئی بچاؤ بیگ پیئے، گاجہ ہوی سیندور	جلد آکر بیا مجھے بچا لو کہ شیر فراق کا ہلاک کئے ڈالتا ہے۔

جب کوئی خبر نہیں ہوتا تو بالآخر بھونرے اور کوّے کی معرفت پیغام بھیجتی ہے یہ دود مفارقت سے جلکر سیاہ ہو چکے ہیں شاید ان کے دل میں رحم پیدا ہو جائے۔

پی سوں کہو سندیس ہیرا، او بھنورا او کاگ	شوہر سے کہو میرا پیغام اے بھونرے اور اے کوّے
سو دھن برہن جرگئی، تیہک دھواں ہم لاگ	جو وہ عورت (ناگمتی) جل گئی اسکا دھواں ہمیں لگ گیا (کہ ہم سیاہ ہو گئے)

یہ تن جاروں چھار کے کہوں کی پون اُڑاؤ — میری جی آتی ہے کہ اپنے جسم جلا کے اور خاک کر کے ہوا کے ساتھ اڑا دوں کہ

مگ تیہ لاگ ہوی پیری کنت دھرئی جہہ پاؤں — شاید تیری راہ میں جا پڑے کہ اسکو پاؤں سے پامال کرے

گھڑی پیہوا اُڑ جن آبے پیہہ پی ٹوٹ — جیسے کبوتر اتر آکر اپنے گھر پہ لوٹنے پڑتا ہے اسی طرح تم بھی اُڑ آؤ

ناریرائی ہاتھ ہے تم بن پاؤ نہ چھوٹ — عورت پہلے ہاتھ گرفتار ہے بغیر تمہارے رہائی غیر ممکن ہے۔

یہ تدبیر کارگر ہوتی ہے رتن سین واپس چتوڑ آتا ہے اور غمزدہ ناگمتی کے پاس بھی وقت گذارنے لگتا ہے پدماوت کو یہ گھڑیاں بہت شاق گذرتی ہیں سوت کی جلن شوہر سے راجہ سے شکایت کرتی ہے۔ ـــہ

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جاتا

پیوں کے نیہہ کنواں منہ میلی — مجھ سے ظاہری محبت کر کے کنوئیں میں ڈال دیا۔

سینچ لاگ جھرانی بیلی — اور خشک بیل (ناگمتی) کو آکے سینچنے لگے

نیتی دو نانی رہٹ کے گھڑے — میری دونوں آنکھیں رہٹ کے گھڑے بن گئیں جو بھرے

بھر ہی تہلے ڈھار ہی چھوچھی بھرے — تھے انہیں خالی کر دیا اور خالی کو بھر دیا۔

سنجہر سرد و ہنس جل گھٹا تو ٹمی اچھو سے — جب تالاب پُر ہوتا ہے تو ہنس رہتا ہے پانی گھٹا تو اڑ جاتا ہے

کنول پریت نہ بچھری، سوکھ بیل پر ہوئے — لیکن کنول کی محبت نہیں جاتی خشک بیل کے ساتھ بھی ہوتی ہے۔

علاؤالدین چتوڑ کے قلعہ میں فروکش ہوتا ہے سامان عیش ونشاط ہر نوع مہیا ہے۔ مگر اس کا دل کہیں نہیں لگتا۔

سو پی جانے نین رس ہردے پیم انکور — لذت نگاہ یار کی وہی جانے جسکے دل میں تخم محبت کا ہو

چند جو بسے چکور چت، نینہہ آو نہ سور — چاند کے دل میں جو چکور بسا ہے تو آفتاب نظر نہیں آتا۔

پیمک لبدھ بہرا او اندھا — آلودہ محبت بہرا اور اندھا ہو جاتا ہے ناچ اور کود

ناچ کود جا ہو سب دھندھا — سب کو دھندہ جانتا ہے۔

جا ہو کاٹھ نچا دے کوئی — جانے وہی جو کاٹ کی پتلی نچا دے۔ جو جس ناچ

جو جیں ناچ نہ پرگٹ ہوئی — میں ہے ظاہر نہیں ہوتا۔

گیت ناد جس دھندھا، دکھ برہ کی آنچ — گانا بجانا اور سب دھندا کیسا اچھا معلوم ہو جسکے دل میں آتش محبت شعلہ زن

من کی ڈور لاگ تنہ کھاہیں جہاں سو گہ پن کھانچ — ہے دل کا رشتہ اسی جگہ ہے جہاں وہ ہی لگا کے کھینچ رہا ہے۔

شوہر قید خانہ میں ہے پدماوت کی حالت قابل رحم ہے۔

کو ؤ نہ بہٹوا پھن پہر دلیو
کیہہ پوچہوں کو کہے سندیسو

ادھر سے کوئی پھرا ایسا وطن کو بھولے کس سے پوچھوں اور کون پیغام ادا کرے۔

جو کوئی جائے تہاں کر ہوئی
جو آوے کچھ جان نہ سوئی

جو کوئی جاتاہے وہیں کا ہو رہتاہے۔ اور جو آتا ہو وہ بالکل بے خبر ہوتاہے۔

اگم پنتھ پیو جہاں سدھاوا
جو رے گیئو سو بہٹ نہ آوا

ایسی دشوار راہ ہے جہاں شوہر گیاہے جو وہاں جاتاہے پھر واپس نہیں آتا۔

کنواں ڈھار جل جیسں بچھوا
ڈول بھرا نینہ دھن روا

کنوئیں سے جس طرح پانی ڈول میں نکلتاہے اسی طرح پدماوت کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور وہ رونے لگی۔

لے جیو بھی تانہ بن تو ہی
کنواں پری ڈھر کا ڈھیس تو ہی

دلبر سے بغیر اے شوہر میں) مثل رسی کے لاغر اور ضعیف ہوں اور بیاہ غم میں ڈوب رہی ہوں کون مجھے نکالے۔

نین ڈول بھر ڈھارے ہیئے نہ آگ بجھای
گھری گھری جیو آوی گھری گھری جیو جای

آنکھوں کے ڈول بھر بھر کے گراتی ہوں مگر دل کی آگ نہیں بجھتی گھڑی میں زندہ اور گھڑی میں مردہ ہوتی ہوں۔

کون گنڈہوں ہیرو کہاں بندہو ناتھ
ہیرین کتہوں نہ پاؤں بسے تو ہردے ماتھ

کس طرف جاکے تمہیں ڈھونڈھوں کہاں قید ہو اے شوہر ہر طرف ڈھونڈھتی ہوں پر نہیں پاتی حالانکہ تم میرے دل میں بسے ہو۔

وہ پنتھ پلکن جاؤں بہاری
سیس چرن کے چلوں سدھاری

وہ راہ پلکوں سے جھاڑ دوں۔ اور سر کے بل وہاں چلوں۔

کو گرو اگوا ہوئے سکھی پنتھ لاوے پنتھ مانہ
تن من دھن بل بل کروں جو رے ملاوے ناہ

کون ایسا پیشوا اور ہادی ہے جو مجھے مالک کی راہ لگا دے تن من دھن اور بل اسکے قربان کردوں جو اس سے ملا دے

دیوپال کی کٹنی پدماوت کو دوسری شادی کرنے کی صلاح دیتی ہے پدماوت کا جواب دیکھیے کٹنی کی تمام منطق کو کس خوبی کے ساتھ کاٹ کیاہے۔

رنگ تاکر ہوں جاروں رچا
آپن تج جو پرائے کچا

وہ حسن ورنگ قابل جلا دینے کے ہے جو اپنا شوہر چھوڑ کے دوسرے کو تاکے۔

دُوسر کرے جائے دُوی باٹا
راجا دوجی نہ ہونہہ اک پاٹا

دوسرا وہ کرتی ہے جو دوسری راہ (جہنم) کو جاتی ہے کہیں ایک تخت پر بھی دو راجہ بیٹھے ہیں۔

جیہ جیسے پیم بہت دِڑھ ہوئی
سُکھ سہاگ سوں بیٹھو سوئی

جس کے دل میں محبت اپنے مالک کی ہوگی۔ وہی عیش اور سہاگ سے بیٹھے گی۔

جوبن جاؤ جاؤ سو بھنورا
پیے کی پریت نجائے جو سنورا

جوانی جاتی رہے اور بھونرا چلا جائے لیکن شوہر کی محبت ہرگز نہیں جاتی۔

محمدؐ کھیل پریم کا، گہر کٹھن چوگاں
سیس نہ دیجے گوی جم، ہل نہوئی میداں

اے محمدؐ کھیل محبت کا دشوار اور سخت دشوار ہے۔ جبتک اس چوگان میں سر نہ دے تب تک میدان سر نہ ہو۔

رتن سین میدان جنگ میں زخمی ہو کر راہی ملک عدم ہوتا ہے پدماوت کے دل کی اضطرابی دیکھئے۔

پہی دُوس ہوں چاہت ناہاں
چلوں ساتھ پیئے دے گل باہاں

اسی دن کے واسطے شوہر کی چاہت تھی۔ سو شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کے ہمراہ جاتی ہوں۔

سارس جیکھ نہ جیئے نیارے
ہوں تم بن کا جیوں پیارے

سارس کی جوڑی جیتے جی جدا نہیں ہوتی۔ تمہارے بغیر اے پیارے ہم جی کے کیا کریں گے۔

نیو چھاور کی تن چھہراؤں
چھار ہوؤں سنگ بہُر نہ آؤں

تن کو قربان کرکے بکھرا دوں گی۔ ساتھ نہ چھوڑوں گی پھر کے نہ روؤں گی۔

دیپک پریت پتنگ جیوں جنم نباہ کریوں
نیو چھاور چہوں پاس ہوئے کنٹھ لاگ جیو دیوں

چراغ کی محبت میں جیسے پروانہ جان فدا کرتا ہے اس طرح ہمیشہ نباہ کرنا چاہیے۔ تیرے قربان ہوکر گلے لگا کر جی دے دوں گی۔

یہ کہہ کر جان قربان کردی اور ستی ہوگئی۔

خواجہ زکریا فیاضی۔ بجنور

Mr. Syed Hamid, P. C. S.
Secy. All India Mushaira, Bijnor.

آتش پر ایک نظر

آتش کے بعض محاسن کلام پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ ان کی دوسری خصوصیات سے لوگ نا آشنا ہو گئے ہیں۔ ہماری تنقید بظاہر اس امر پر متفق نظر آتی ہے کہ آتش کا کلام زور اور جوش اور ولولہ اور ترنگ ہے۔ وہ ایک رندِ سرمست ہے۔ ایک قلندر ازلی۔ اس کا کلام سراسر آمد ہے آورد سے اسے سروکار نہیں۔ لیکن یہ مکمل حقیقت نہیں اور اگر رائج الوقت تنقید کی نگاہ سے بچا کر براہ راست آتش کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو کچھ مختلف انکشافات ہوں گے۔

آتش نے اپنے اوپر بے شمار مالایلزم پابندیاں عائد کر لی ہیں جنھوں نے اُن کے اشہبِ فکر کی جولانگاہ کو بہت محدود کر دیا ہے۔ ان میں سب سے پہلے سنگلاخ زمینیں اور تباہ کن ردیفیں ہیں۔ چند ردیفیں یہ ہیں

(آغوش) میں دریا، سے پیدا، (دامن) زیرپا، کھٹکا - چلا، آفتاب، مطلب، خواب، کاٹ، چوٹ، چمن کی شاخ، رنگ سرخ، حسرتِ صبح، بادام) سفید، دستار بند، لحد کا تعویذ، آسمان بالائے سر، زیر بام رقص، غلط، (کاشانہ) شمع (آہنگ) شمع (ایوان) تنگ، باغ میں، تر خشک ہو، (چراغاں) سبز ہو۔ پرستار آفتاب، سانپ، مت قی چاند سورج، پیچ پیچ - بلند، ٹھنڈ، (کفن) سے پاؤں، وغیرہ وغیرہ

کلام کا معتدبہ حصہ اس قسم کی ویران کن ردیفوں کی نذر ہو گیا ہے۔ لیکن ردیف کے خلاف احتجاج کرتے وقت یہ نہ بھول جانا چاہیئے کہ طویل اور مشکل ردیف ہر صورت میں شعر کے لئے مضرت رساں نہیں ہوتی۔ جو لوگ ردیف کی مذمت کرتے ہیں انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ اگر ردیف کا مضمون غزل کے آہنگ و معنی سے ہم نوا ہو تو اس کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس کی معنوی یگانگت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً آتش ہی کی غزل ہے۔

کوچۂ دلبر میں میں۔ بلبل چمن میں مست ہے	ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے
نشۂ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے	مردِ مفلس حالتِ رنج و محن میں مست ہے
دورِ گردوں ہے خداوندا کہ یہ دورِ شراب	دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے
غافل و ہشیار ہیں اس چشم میگوں کے خراب	زندہ زیر پیرہن، مردہ کفن میں مست ہے
ایک ساغر دو جہاں کے غم کو کرتا ہے غلط	اے خوشا طالع جو شیخ و برہمن میں مست ہے

اس غزل کا شمار اردو کی بہترین غزلیات میں ہونا چاہیئے، اور لطیف خمریات میں یہ کسی سے فروتر نہیں۔ نظر کی یہ تازگی

اور یہ تحیّر دوسرے درجہ کے شعرا کی دسترس سے باہر ہے اور اس کی آتش کے یہاں فراوانی ہے۔ یہ تو واضح ہوگیا ہوگا کہ اس کی تاثیر میں ردیف "مست ہے" کو بھی دخل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ردیف بذات خود کوئی بری چیز نہیں۔ اس کے غلط مصرف نے اسے مورد الزام کردیا ہے۔ ورنہ صوری اور صوتی محاسن کو تو یہ بڑھاتی ہی ہے اکثر معنوی محاسن میں بھی اضافہ کردیتی ہے۔ اگر ردیف مضمون شعر سے میل کھاتی ہو تو اس سے بہتر شعر کے لئے زیور نہیں اور اگر متبائن ہے تو اس سے بدتر پابندی نہیں۔ ردیف ہماری شاعری کے عناصر ترکیبی اور اس کے ترنم کے اصول میں سے ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی آتش نے جدّت مزاج کو بیٹھنے نہ دیا۔ اس بنجر میدان میں انھوں نے مضامین نو کے گل کھلائے۔ ان کے تخیّل نے پابجولاں رہ کر بھی جولانی کی۔ باریک تار پر وہ اسی سرعت کے ساتھ گامزن ہوئے جیسے دوسرے لوگ فراخ راستہ پر۔ وہ اپنے دوسرے کمالات کی طرح اس کا مظاہرہ بھی کرنا چاہتے تھے کہ بند شیں ان کے لئے بند شیں نہیں جس طرح زندگی میں انھوں نے عسرت میں فراخ دلی کی شان دکھائی اس طرح شاعری میں آتش پابندیوں کے باوجود آزاد ہے۔ مشکل زمینوں میں بھی وہ مضامین کا خون نہیں ہونے دیتے۔ ان کی ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے سانپ۔ میں مثال کے طور پر یہ تمام و کمال آپ کو سناؤں گا۔ سانپ کے زہر نے مضامین کو گھایل ضرور کیا ہے مگر ہلاک نہیں کرسکا۔ اور یہ ایسا کمال ہے جس میں آتش کا شاید ہی کوئی شریک ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر شعر ایک نئے مضمون کا حامل ہے اور کم و بیش ہر مضمون میں ندرت کی لہر موجود ہے۔

بل کھا سکے نہ صورتِ گیسوئے یار سانپ — توڑے مروڑے اپنے بدن کو ہزار سانپ

احول کی آنکھ سے ہوں میں سودائی دیکھتا — دو زلفیں یار کی نظر آتی ہیں چار سانپ

کیونکر نہ پھاڑ پھاڑ کے پھینکوں میں پیرہن — سودائے زلف یار میں ہر تار تار سانپ

تار پیرہن کا سانپ ہونا، کس قدر موثر ذو پیرایہ ہے۔ یہ کلفتِ عشق کے بیان کا

افشاں چھڑک کے یار نے زلفِ سیاہ پر — دکھلا دیا وہ سنتے تھے جو مالدار سانپ

زلف کو مار سے تشبیہ دیتے چلے آئے ہیں مگر زلف و افشاں کو گنج و مار سے تشبیہ آتش کی اختراع ہے

موذی بھی متفق اثر حسن سے ہوئے — کرتے ہیں گنج یار کے اوپر نثار سانپ

ہر عقدہ گانٹھ زہر کی موذی ہے بال بال — کاکل ہے ایک یار کی کالے ہزار سانپ

یہ پہلی تشبیہ پر ترقی ہے

دھوون کی زلفِ یار کی پائی نہ سمیت — کف لا کے زہر اگل کے ہوئے شرمسار سانپ

اس زلف میں ہو چھپا ہے مرا داغ دار دل — طاؤس کو سمجھتے ہیں اپنا شکار سانپ

داغدار دل اور طاؤس کی تشبیہ بہت دور از کار ہے۔ تاہم نادر ہے اور اس دور میں اس قسم کی تشابیہ سکہ رائج نہیں

سودائے زلف میں ہے جو کچھ حال کیا کہوں — رہتا ہے رات دن مرے سر پر سوار سانپ

روئے صبیح پر نہیں لہرا رہی وہ زلف — جو یا کے یاسمیں کی ہے بے اختیار سانپ

یہ شعر تو حاصل غزل ہے۔ تشبیہ بلیغ ہے اور متحرک اور مرکب، ایک تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ ذہن قاآنی کی مشہور تشبیہ

دو زلف تابدار او بہ چشم اشکبار من
چو چشمہ کہ اندرو شنا کنند مارہا

کی طرف منتقل ہوتا ہے مگر اس میں تصنع ہے اور آتش کی تشبیہ میں سادگی اور واقعیت

موذی کو چاہتا ہے قوی آسمان دوں — پوجا نیا کرتا ہے یہ بد شعار سانپ

مضمون یقیناً نیا ہے اور اس دیس کے تجربہ پر مبنی

آتش یہ شاعروں کا فقط اختراع ہے — رخسار گنج ہیں نہ تو گیسوئے یار سانپ

مقطع میں آتش نے ذہنی آزاد مزاجی کا اظہار نئے طریقے سے کر دیا ہے یعنی شعرا کے مفروضات کی تردید کر کے یہ اور بات ہے کہ وہ اس تردید کی خود جا بجا تردید کرتے ہیں۔

لہذا جب آتش یہ دعویٰ کرتے ہیں

آتش زمین شعر ہو ہر چند سنگلاخ — لغزش سے آشنا نہیں اہل سخن کے پاؤں

تو ہم کو نکتہ چینی نہ کرنا چاہیئے۔

کثرت مشق سے سنگلاخ زمینیں دشوار ردیفیں اور بندھی ہوئی تلمیحیں ان کے لئے سہل اور فطری ہو گئی ہیں۔ ان بندشوں کے نرغہ میں بھی اکثر ان کی آزادی محفوظ رہتی ہے اور اس امر میں وہ حافظ سے مشابہ ہیں لیکن اس مشابہت پر زیادہ زور نہ دینا چاہئے۔ کیونکہ حافظ کے یہاں رعایت کی طرف قارئین کی توجہ بہت کم مبذول ہوتی ہے اور آتش کے یہاں اکثر ردیف کی طرح آتش کے یہاں اکثر قوافی بھی آورد کے ضامن ہیں ایک غزل کا مطلع ہے ؎

اے فلک کچھ تو اثر حسن عمل میں ہوتا
شیشہ اک رات کو قاضی کی بغل میں ہوتا

اس میں قوافی۔ بغل، بیت و عمل، پنجہ شل، خورشید حمل، عسل کنول وغیرہ باندھے گئے ہیں۔ قوافی مضامین کے تابع اسی وقت تک رہتے ہیں جب تک وہ وافر ہوں اگر قوافی کی تعداد کم ہے تو لامحالہ مضامین اُن کے محکوم ہو جائیں گے، ٹیڑھی ردیف

اور مشکل قافیہ کا سبب مضرت رساں پہلو ہی ہے۔ نہ آتش کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد جو قافیہ نے کہلوائے ہیں کوئی کم ہے۔ قوافی جس قدر کم دستیاب ہوتے ہیں اُسی قدر مبتذل اشعار کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ آتش کی ایک غزل کا مطلع ہے ۔

ہوا ہے عشق ہم کو اُس کے نورِ پاک سے پیدا
کیا ہے نور کے پُتلوں کو جس نے خاک سے پیدا

اس غزل میں جہاں ادراک، افلاک اور پاک کے قوافی آئے ہیں وہاں حکّاک، ڈاک، ناک اور امساک بھی باندھے گئے ہیں ستم یہ ہے کہ آتش، لکھنؤ کے بیشتر شعرا کی طرح کسی قافیہ کی آزادی گوارا نہیں کرتے۔ جو ذہن میں آ گیا باندھا ضرور جائے گا ۔
اسی مشق کا ایک مظاہرہ دو غزلے ہیں جو کلیاتِ آتش میں جا بجا ملیں گے پہلے دو ورق اُلٹتے ہی دو غزلہ پر نظر پڑتی ہے جس کے مطلع یہ ہیں ۔ ؎

؎ اے جنوں دشتِ عدم کے کوچ کا ساماں کیا — جسم کے جامہ کو میں نے چاک کا داماں کیا
؎ چاندنی میں جب تجھے یاد اے مہِ تاباں کیا — رات بھر اختر شماری نے مجھے حیراں کیا

چند صفحہ بعد پھر ایک دو غزلہ ملے گا ؎

تصورِ ہر نفس ہے پیشِ چشم اس روئے روشن کا
نگہباں برق کو میں نے کیا ہے اپنے خرمن کا

اس دو غزلہ میں تیس شعر ہیں اور ویسے بھی ان کی غزلیات میں اشعار کا اوسط پندرہ اور بیس کے درمیان رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ آتش کے یہاں اکثر غزلوں میں شعر صرف دو ایک ہوتے ہیں، باقی بھرتی اور ایسی غزلوں کا شمار بھی آسان نہیں جہاں صرف ردیف ہی رکھ دی ہے۔ قوافی اور مضامین کا بے امتیازانہ استعمال آتش کی ایک بنیادی خصوصیت سے متعلق ہے جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ یہاں پر یہ اشارہ کافی ہوگا کہ آتش سب کچھ ہوں مگر طبعاً اعتدال پسند نہ تھے۔ فیاضِ ازل نے انھیں جوش و خروش عطا کیا اور قوتِ ممیزہ سے محروم کر دیا۔ قارئین کو آتش کے یہاں ہر قدم پر اس قوت کے فقدان کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے مظاہر صوری بھی ہیں اور معنوی بھی۔ دو غزلہ کا ذکر آیا ہے تو اس کی ابتدا ضرورت اور جواز پر بھی غور کر لیا جائے۔ یہ کم و بیش لکھنؤ کی پیداوار ہے اس کی ابتدا درباری شاعروں کے تفاخر، تقابل اور نوک جھونک سے ہوئی۔ علاوہ بریں شعر فروشی اور شاگرد نوازی نے بھی اُستادوں سے ایک ایک زمین میں کئی کئی غزلیں کہلوائیں۔ اس کے جواز سے متعلق یہ کہنا کافی ہوگا کہ دو غزلہ اسی صورت میں شعریت سے ہمکنار ہو سکتا ہے کہ زمین آسان اور قوافی شگفتہ اور وافر ہوں اور یہ جائز جب ہی ہوگا جب پہلی غزل میں ایک مضمون ہو اور دوسری غزل میں دوسرا یا یہ کہ پہلی غزل کے اشعار میں جو معنوی یکانگت ہے دوسری غزل کے اشعار میں اس سے مختلف، ورنہ ایک

مقطع اور ایک مطلع کی دوہری دیوار کھڑی کردینے سے کیا حاصل -

ہم نے دیکھ لیا کہ آتش کے ایوانِ تصنع کا ایک ستون دیران کُن ردیف دوسرا مشکل قافیہ اور تیسرا دوغزلہ یا طویل غزل ہے - یہ تینوں عروض کے اعتبار سے ہیں۔ چوتھا ستون رعایت لفظی ہے جو ہر چند ناسخ کی بہ نسبت کم ہے تاہم کم نہیں۔ یہ چیز اس زمانہ کی فضا میں ساری تھی اور آتش اس کے لئے مورد الزام نہیں بلکہ آن کے یہاں یہ داغ نسبتاً ہلکا ہے اور کہیں کہیں تو رعایت لطافت لئے ہوئے ہے ۔

رُخ و زلف پر جان کھویا کیا	اندھیرے اجالے میں رویا کیا
ہمیشہ لکھے وصف دندان یار	قلم اپنا موتی پرویا کیا
بھڑکانے سے آتش کو جلانے لگے یار تو	الطاف وعنایت کے سزاوار ہیں ہم
تم جو گویا ہوئے تو پھول جھڑے	غنچہ سے مُنہ میں رنگ لائی بات

اساتذہ کے یہاں رعایت لفظی کی مثالوں پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ شعر میں اگر رعایت کے علاوہ کچھ اور بھی ہو تو رعایت سے شعر کو چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن اگر مضمون کی یہ اندرونی تہ غائب ہے تو شعر رعایت برائے رعایت میں پھنس کر رہ جاتا ہے آتش کے یہاں رعایت لطیف اور رعایت قبیح دونوں کی مثالیں ہیں

ہماری قبر پر وہ شعلہ رو آئے	رہے روشن چراغِ مہربانی

صاف ظاہر ہے کہ رعایت ہے مگر چونکہ مضمون کی تہ رکھتی ہے - لہذا گراں نہیں گذرتی - اسی طرح

ممکن خزاں نہ ہوئے بہارِ شباب کو	گُل ہو نہ تیرے حُسن کا لے گلبدن چراغ
نڈھالیں آج کے وعدہ کو کل کے اوپر آپ	یہ جبر ہے دلِ بے اختیار کے نزدیک
نہیں کوتاہ کسی حال میں قسمت میری	خشک ہو جاتا تو ہو زلف کا شانہ شبِ وصل

رعایت اکثر حالات میں تصنع سے ہمرکاب ہوتی ہے - علاوہ بریں اکثر ہمجنس الفاظ جمع کرنے کا شوق اشعار کو مبتذل کر دیتا ہے۔ مراعاۃ النظیر کی آبیاری بیشتر شعریت کے لہو سے کی جاتی ہے مثلاً

لہو کا اپنے مثل کوہکن میں آپ پیاسا ہوں	مزا پڑتا نہ مجھ کو کاش اس شیریں کلامی کا
جب کسی لیلیٰ شمائل کا سُنا کانوں سے ذکر	بید مجنوں کی طرح میں تھرتھرا کر رہ گیا
زوال حُسن کھلواتا ہے میوے کی قسم تجھ سے	لگایا داغ خط نے آن کر سیب زنخداں پر
سراسر شست کا عالم ہیں ہر ایک مو میں پاتا ہوں	تری زلفوں کو شانہ چاہئے دندانِ ماہی کا

ہمیشہ جوشِ گریہ سے رہا پانی میں اے آتش | کبھی تازہ نہ اپنے دل کا لیکن یہ کنول پایا
سنا ہے شورِ سگ کوئے یار جب ہم نے | خوشی سے پوست کے باہر ہر استخوان نکلا

رعایتِ لفظی کے علاوہ آتش کے یہاں رعایتِ خیالی یا موشگافی بھی کثرت سے ملتی ہے۔

ع یقین منزلِ محبوب اس پر مجھ کو ہوتا ہے | دلِ صد چاک میں میرے ہے صاف انداز چلمن کا
ع کیا مدام مجھے اشکِ آتشیں نے تر | ہمیشہ میرے نہانے کو گرم آب ہوا
ع وہ دہن ہے چشمۂ شیریں تبسم موج ہے | وہ ذقن ہے چاہ خال اس میں کوا ہے چاہ کا
ع کیا عجب روئے جو ماتم میں ہمارے وہ بت | چشمۂ کوہ کے اوپر سے ہے دریا اترا
ع دل کو الجھایا گرہ پڑنے سے زلفِ یار میں | دانے کا دھوکہ مجھے دیتا ہے عقدہ دام کا
ع کرتی ہے یاں زبانِ کمر یار میں کلام | معدوم ہے جواب ہمارے سوال کا
ع اس قدر کا ہیدہ ہوں پس جائے تیرہ آبلہ | سوکھ کر کانٹا اگر میری برابر خشک ہو

اردو کے بیشتر اساتذہ کی طرح آتش کا کلام بھی بہت ناہموار ہے، نہایت بلند اور نہایت پست اشعار پہلو بہ پہلو ملیں گے
مبتذل اشعار کی فہرست بہت طویل ہے مثلاً ع

چار دن ہے گرم بازارِ شباب اے نونہال | کوڑیوں کے مول بہ سیبِ ذقن ہو جائے گا
روئے بت پہ آنکھ میری طرح رغبت کی نہ ڈال | سامنا قصاب کا اے برہمن ہو جائے گا
حسن کی طرح سے آیا نہ مرے عشق میں فرق | زلفیں واں منڈ گئیں یاں حال پریشاں نہ گیا
بعد فنا بھی رنگِ طبیعت نہ جائے گا | تربت سے میری پیڑ اگے گا پتنگ کا
بوسہ جو خالِ لب کا لیا یار نے کہا | اس تل کا تیل پی کے ہو چکنے گھڑے میئے
ہمسایہ ہے دونالی بندوق سے وہ بینی | چھروں کا کام رونے قاتل کے خال کرتے
آتی ہے عید قرباں خنجر کو لال کرتے | دنبہ کے بدلے فربہ عاشق حلال کرتے
باہر نہ پائیچے سے ہوں اس گلبدن کے پاؤں | پھیریں چھری نہ پنجۂ قصاب بن کے پاؤں

ناہمواری اکثر [illegible] کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ایک ہی غزل میں یہ دونوں شعر پہلو بہ پہلو ملتے ہیں

لب جاں بخش کے اعجاز کا علیلی ہو قتیل | سامری کشتہ ہے آنکھوں کی فسوں کاری کا
نخلِ امید کو پہنچے نہ کہیں اس سے گزند | کام کرتی ہے مری آہِ سحر آری کا

دوسرے شعر کو گرا دینے کا ذمہ دار بڑی حد تک "آری" کا قافیہ ہے۔ آتش کے یہاں الفاظ کا حس زیادہ لطیف نہیں تھا اور اکثر کسی شعر میں ابتذال کا ذمہ دار صرف ایک غیر شاعرانہ لفظ ہوتا ہے۔

(۱) بتیاں اس کی بنا کر میں کروں روشن چراغ — یاد سے اڑ کر بجھا دے گر مرا دامن چراغ

(۲) ہمارا طالع خفتہ کہیں نہ پس جائے — یہ سر پہ اس کے ہے بے ڈھب ہجوم خواب ہوا

(۳) بل ان کی زلف پیچاں کی طرح کیا کھائے گا سنبل — وہ ایسے بدبلا بٹنے کی چوٹی کو کترتے ہیں

(۴) ٹھڈی کے گرد یار کے خال سیہ نہیں — بجھ کر ہیں رہ گئے لب چاہِ ذقن چراغ

بتیاں، بے ڈھب، بدبلا بٹنے اور ٹھڈی کی شعریت آتش کے نزدیک مسلم ہے

گلے کو کاٹ کر اپنے شہیدان محبت نے — لہو کے گھونٹ گھونٹے ہیں خلائے یار پہ کیا کیا

گھونٹے نے شعر کو ابتذال کی حد تک گرا دیا ہے۔ مگر آتش کو احساس بھی نہیں۔ اس کا تعلق ان کی ایک بنیادی خصوصیت قوت ممیزہ کے ضعف یا فقدان سے ہے اور اس کا مظاہرہ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے ہوتا ہے کہیں وہ غزل میں نرم و نازک اشعار کے درمیان بغیر محسوس کئے ہوئے کوئی بہت بھونڈا لفظ استعمال کر جاتے ہیں اور کہیں وہ لطیف خیالات اور پرجوش جذبات کے سلسلے میں کوئی نہایت مبتذل خیال باندھ جاتے ہیں ؎

کنڈی چڑھا کے شام سے وہ شوخ سو رہا — ٹیکا کیا میں سر کو پس در تمام رات

یہ اکثر رعایت لفظی یا رعایت خیالی کے تابع ہوتا ہے۔ آتش کے یہاں انتہائی احتیاط اور روک تھام بہت کم ہے، وہ جب طغیانی پہ آتے ہیں تو خس و خاشاک کو بھی بہا لیجاتے ہیں۔ اور کہیں وہ حسین و جمیل نقش و نگار کھینچتے کھینچتے اپنا ہی بھنڈی لکیریں بنانے لگتے ہیں، جو دماغی فضا ماقبل کے اشعار نے تیار کی تھی وہ چشم زدن میں دھکے کے ساتھ مسمار ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر اشعار کے ربط پر ظاہر ہے

نہیں بے وجہ ہنسنا اس قدر زخم شہیداں کا — تری تلوار کا منھ کچھ نہ کچھ لے تیغ زن بگڑا

تکلف کیا جو کھوئی جان شیریں پھوڑ کر سر کو — جو غیرت تھی تو پھر خسرو سے ہوتا کوہکن بگڑا

کسی چشم سیہ کا جب ہوا ثابت میں دیوانہ — تو مجھ سے مست ہاتھی کی طرح جنگلی ہرن بگڑا

پہلا شعر نشتر ہے، دوسرا شعر درمیانی ہے۔ اس میں تھوڑی سی رعایت ہے (جان شیریں و کوہکن) جو گراں نہیں گزرتی۔ لیکن رعایت لفظی کے شوق کی آتش کبھی مدافعت نہیں کرتے اور نہ انھیں رعایت ملیح و رعایت قبیح کے فرق کا احساس ہے تیسرے شعر میں رعایت حد سے بڑھ گئی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی شعر میں ایک مصرع ارفع اور ایک پست ہوتا ہے مثلاً آتش کا ایک مطلع ہے

کوئے جاناں چمن سے بہتر ہے — اس کا کتا ہرن سے بہتر ہے

حاصل کلام آتش کے یہاں ابتذال کا باعث ان کی قوت ممیزہ کا ضعف ہے اور یہ ابتذال یا تو رعایت کی شکل اختیار کرتا ہے یا ردیف اور قافیہ کے استبداد کا نتیجہ ہوتا ہے۔

تصنع اور ابتذال تو خیر آتش کی شاعری کے وہ مذموم پہلو تھے جن کی طرف ابھی تک تنقید متوجہ نہیں ہوئی لیکن ان کے محاسن کلام کی فہرست بھی زور و جوش رندی اور آزاد طبعی کہہ دینے سے مکمل نہیں ہو جاتی۔ ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ مجھے ان کی جس خصوصیت پر سب سے زیادہ زور دینا ہے وہ آتش کا نہایت اعلیٰ تخیل ہے۔ اس خیال سے دور از حقیقت کوئی رائے نہ ہوگی کہ آتش کا کلام سراسر آمد ہے۔ ان کے کلام میں جا بجا اس قسم کے اشارے ملتے ہیں کہ مشق سخن سے زیادہ جانکاہ کوئی مشغلہ نہیں مثلاً

رہا کرتی ہے فکر شعر گوئی　　　کیا کرتے ہیں ہم خون جگر خرچ

گہر سے آبدار آتش ہو منہ سے بات جو نکلے　　　تکلف شرط ہے آویزہ گوش سخنداں میں

فکر اشعار کو لازم ہے دماغی قوت

روز و شب رہتی ہے مرغان مضامیں کی تلاش　　　فکر سے کرنا پڑا ہے کار صیادی مجھے

آتش خدا کے واسطے موقوف فکر شعر　　　طاقت نہیں دماغ کو نظم کلام کی

خون جگر سے پرورش شعر ہم نے کی　　　فرزند کا سلوک کیا خانہ زاد سے

مضمون باندھ لائی ہے فکر اپنی عرش سے　　　ڈھونڈا ہے جب تو ہم کو ملا ہے شکار دور

اڑ کے آتش سے کہاں مضمون عالی جائیگا　　　شاہ تیر انداز کب چوکا نشانہ تیر کا

ناتواں ہو جاتا ہے فکر سخن سے آدمی　　　رشتہ کر دیتا ہے آتش اس گہر کا انتظار

وہ صید افگنی کا لطف دکھاتا ہے دام فکر　　　مضموں کو جانتے ہیں ہم آیا شکار ہاتھ

شعر گوئی میں مری طبع کو دقت ہے پسند

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

بندش چست سو بیری آتش　　　قافیہ تنگ رہا کرتا ہے

مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ آتش کی طبیعت دقت پسند تھی اور وہ شعر گوئی میں کافی توجہ اور وقت صرف کرتے تھے۔ اس دقت پسندی کے اچھے اور برے دو　　ہیں۔ یہ جانفشانی جہاں تخیل کی آلہ کار ہوتی ہے وہاں گہر آبدار ہاتھ آتے ہیں اور جہاں تخیل کو چھوڑ کر محض دماغی ورزش رہ جاتی ہے وہاں فرسودہ مضامین اور سوقیانہ اشعار کے انبار لگا دیتی ہے۔ (خوان و پوسف، ستری و دیوانہ، سعد وحی کمر و دہن، چاک و گریباں، طفل و دیوانہ، پنجہ مرجاں و دست یار، کبک و رفتار

معشوق، سرو وقمری، آئینہ وسکندر، مصحف و رُخ، کعبہ و دل، خال اور تل، بُت وکہسار، چاہِ ذقن، سلطان وفقیر، شیریں کوہکن ذرّہ و آفتاب، حباب وقلزم ـــــــــ یہ مضامین اور تلمیحات آتش نے بار بار استعمال کی ہیں اور سوائے اس صورت کے جب تخیل نے ان کو کوئی قطعًا نیا پہلو دے دیا ہو انھیں پڑھ کر طبیعت صرف مکدّر ہوتی ہے۔ تکرار اور وہ بھی اس افراط سے کیونکر ناگوار نہ ہو۔ لیکن یہیں آتش کی جدّتِ طبع کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ان بے حد پامال مضامین سے بعض اوقات وہ وہ نئی نئی باتیں پیدا کی ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ ان ہی فرسودہ مضامین کو وہ قطعًا نئے مصارف میں لائے ہیں۔ آتش کو خود یہ دعویٰ ہے کہ ؎

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی	جب سنائی نئی سُنائی بات

اور ؎

مضمونِ رفتگاں سے طبیعت کو اپنی ننگ	گاہک نہ ہو دیں ہم کبھی مُردے کے مال کے

پہلے دعوے کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ آتش کی تازگیٔ فکر پر حرف لانا کفر ہے لیکن جب سنائی نئی سُنائی بات کے متعلق شبہے کے موقع ہر صفحہ پر ملیں گے۔ دوسرے دعوے میں صرف اس قدر ترمیم کی ضرورت ہے کہ مُردے کے مال کے گاہک ہونے میں آتش نے کبھی تامّل نہ کیا۔ مگر اس سودے کو صیغۂ راز میں ہی رکھا اور اس کے اخفا کا اہتمام بڑی جانفشانی سے کیا۔ مُردے کے مال کی اُنھوں نے قطع و بُرید نئے سرے سے کی اور اُسے بازار میں اپنا بناکر پیش کیا۔ اس کوشش میں بعض اشعار تازہ اور فرحت انگیز بھی کہہ گئے اور اُن سے زیادہ فرسودہ اور مصنوعی، میں اول الذکر کی چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ دیکھئے پامال تلمیحات سے انھوں نے کیسے نئے اور کتنے مختلف مفاہیم ادا کر دئے ہیں

یوسف و کارواں :۔

راہِ الفت میں نہیں اندیشۂ پست و بلند	گر کے کب یوسف میانِ چاہِ کنعاں رہ گیا
اور اللہ رے جذبِ اُلفت یوسف کو چاہ میں ہم	باہر نکالتے ہی پھر کارواں نہ ٹھیرا

قارون و گنج قارون :۔

محبت ہوتی ہے معشوق کو بھی عاشقِ کامل سے	زمیں میں ساتھ قاروں کے گڑا ہے گنج قاروں کا

فرہاد و شیریں :۔

شیریں بھی چاہتی جو اُسے پیرزن تو کیا	خسرو بھی دیکھ سکتا نہ فرہاد کی طرف
لب بہ لب فرہاد کو شیریں سے ہونا ہے محال	لعل قسمت میں نہیں کاٹا کرے کہسار کو

چاک و گریباں :-

وہ گریباں آگ میں رکھ دیجئے | موسم گل میں جو ہوں بے چاک کے

خضر و سکندر :-

غیر خواہاں ہو تمہارے وصل کا لے یار تو کیا | حصہ خضر جو ہے بخت سکندر میں نہیں
تال کار کی صورت بھی آنکھوں کو نظر آتی | لگا دیتا تھا اک آئینہ بھی قبر سکندر میں
حسرت آب بقا کا نقش دل پر سے مٹا | گور میں ایسا نہ ہو حلق لے سکندر خشک ہو

کعبہ و بت :-

غرور حسن سے بیجا جو ناز کرنے لگے | بتوں کو کعبے سے اللہ نے نکال دیا

دہن و کمر کے بعد فرسودہ مضامین کے متعلق آتش نے جب کہی ہے نئی بات کہی ہے اور طرح طرح کی لطیف موشگافیاں کی ہیں

قصہ کوتہ دہان یار کا تھا | حجتوں نے مری بڑھائی بات
بندھے دہان و کمر کے ہزار ہا مضمون | زمین شعر سے گنجینہ نہاں نکلا
کیا ہر جس نے کمر میں تری سوال کو دوست | ہوا ہے غیب سے آوازہ جواب بلند
بجا گئے آستہ بیچ اس کو شاعر | مگر کا کوئی ہم سے مضموں نہ نکلا
دہن بھی ان کے گماں کیسے کیسے | کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

گلشن شداد :-

پھرتے ہیں ڈھونڈتے نظر آتا نہیں کہیں | کوئے بتاں بھی گلشن شداد ہو گیا

فرسودہ مضامین کو نئے مفاہیم کے اظہار کا وسیلہ بنانا، ان میں سے مضامین پیدا کرنا، انھیں نئے طرز سے باندھنا یہ آتش کے تخیل کا صرف ایک صورت ہے، اس سے ارفع وہ تازگی مضامین ہے جس میں اردو کا کوئی شاعر آتش کا حریف نہیں، اس کا عنصر تازگی نظر ہے۔ آتش کا زاویۂ نگاہ بہت منفرد تھا اور وہ ہر بات کو نئی نظر سے دیکھتے تھے خواہ وہ کوئی دقیق مسئلہ ہو یا روزمرہ کا کوئی واقعہ یا کوئی تماشائے طبع۔ صف اول کے شعرا کو ہی یہ تازگی نگاہ میسر ہوتی ہے، وہ دنیا سے ہٹ کر اس پر نظر ڈالتے ہیں اس لئے بہت سے وہ پہلو ان پر روشن ہو جاتے ہیں جو اس ہنگامہ میں ہماری نظر اور توجہ سے مخفی رہتے ہیں

کھلا یہ ہم کو دم نزع کے تنفس سے | کشاں کشاں لئے جاتا ہے شوق منزل کا
بیدار ہونے پہلوئے گل میں گذر جاتی ہے رات | یاد آتا ہے جو شبنم کو کنارہ آفتاب

زبانِ یار خموشی نے میری کھلوائی　　ہیں قفل بن کے کلید درِ خزانہ ہوا

نہیں ہو شل صدف مجھ سا دوسرا کمبخت　　نصیب غیر میرے منہ کا آب و دانہ ہوا

ہمیں ڈالا دل کو خالِ عنبریں یار نے　　کیا سمجھتا تھا ہیں دانہ آسیا ہو جائے گا

قصہ کوتاہ دہانِ یار کا تھا　　مجنوں نے مری بڑھائی بات

معدومیٔ دہن کے متعلق اشعار بے شمار ہیں مگر آتش کے اس شعر پہ ترقی مشکل ہے ؎

خوشی کے مارے زمین پر قدم نہیں پڑتے　　جرس سے مژدۂ منزل ہے کارواں سنتا

یہ صدا آتی ہے خموشی سے　　منھ سے نکلی ہوئی پرائی بات

زمانہ میں نہیں مجھ سا کوئی ہے دریا نوش　　حباب وار ہے سر میں بھری ہوائے قدح

اس شعر میں رعایت ہے مگر رعایت پر مضمون شعر کی بنیاد نہیں، نہ یہ کسی طرح مضمون کو پا بجولاں کرتی ہے۔ لہٰذا لطیف ہے، رعایت لفظی کے متعلق یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ رعایت اگر صرف زیور کی حد تک ہے تو جائز ہے اور اگر وہ جسم بن گئی تو شعر کو بے جان کر دیگی
ع حباب وار ہے سر میں بھری ہوائے قدح، یہ مصرع کتنا پُر زور ہے اور حباب کا استعمال کس قدر ندرت آمیز
مضمون آفرینی کی چند اور مثالیں پیش کرتا ہوں:-

ذرّے ہماری خاک کے برباد گو رہیں　　ہونگے کسی تو روزنِ دیوار کی پسند

نہ روزِ حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے　　جفائے یار کے آڑے مری دعا آئی

سبقت جو زندگی میں سکندر سے کی تو کیا　　اے خضر پیچھے مرگ کی منزل میں رہ گیا

صیاد اسیرِ دام رگِ گل ہے عندلیب　　دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے دام و دانہ کیا

بنایا جادۂ رہ مجھ کو خاکساری نے　　پھرا جو مجھ سے زمانہ میں وہ خراب ہوا

عمرِ خضر سے اس کی زیادہ ہے زندگی　　دھوون پیے جو یار کی زلفِ دراز کا

عشق نہفتہ ہو ویگا اشکوں سے آشکار　　یہ طفل کھیل کھیلیں گے افشائے راز کا

طفل اشک ایک پامال سی بات تھی، لیکن کھیل اور وہ بھی افشائے راز کے کھیل نے اس میں تازگی پیدا کر دی ہے

عاجز نہ ہو تصوّرِ حسن و جمال میں　　مہندی بندھی نہیں ترے پائے خیال میں

گو ہر شبنم بہم پہنچا ہیں گلہائے چمن　　یار کا سا خندۂ دنداں نما ہوتا نہیں

حسبِ معمول اوپر کے شعر میں بھی آتش نے گل و محبوب کی پرانی تشبیہ کو شبنم و دنداں کی ذیلی تشبیہ کا اضافہ کر کے حیات تازہ بخش دی ہے

۵۔ دیکھئے کٹ چکے کب بیستا کا اپنی یہ پہاڑ   دردِ سر صورتِ فرہاد کیا کرتے ہیں

یہاں پھر فرسودہ تلمیح سے نیا کام لیا ہے۔

کٹ جائے وہ زباں جو کہے شمع یار کو   ہرگز زبانِ یار سے باہر دہاں نہیں

اوپر کے شعر میں رُخِ یار کے مقابلہ میں شمع کو کس قدر حقیر اور مضحکہ خیز بنا کر دکھا دیا ہے۔

بتوں کے عشق نے آخر دکھایا دل کو اُن کے بھی   برہمن پردۂ ناقوس میں فریاد کرتے ہیں

مارا ہے ضبط نے مجھے عشقِ حبیب میں   مُردہ مرا جلائیں تو اُس میں دھواں نہ ہو

قیامت میں بھی کوئی حال کو اُن کے نہ پوچھے گا   کیا ہو کشتہ جسکو تو نے شمشیرِ تغافل سے

کھلے چمن میں جو گیندے کے پھول تو یہ کھلا   کئے بہار نے ظاہر خزاں کے پنہاں چاک

رقص کرتا ہے شاید کہ لگے ہیں آتش   رگِ گل سے قفسِ بلبلِ بے تاب میں بند

گردش ہے جو قسمت کی وہ موجود ہے واں بھی   گو شیشۂ ساعت میں ہے ریگِ رواں بند

جلتا ہے خود بھی قبر میں روشن کیا کریں   غربت زدوں کے نام کے اہلِ وطن چراغ

زلفِ لیلیٰ سے سوا ہر سطر سودا خیز تھی   ہو گیا دیوانہ مجنوں پڑھتے ہی دیوانِ عشق

تولتے ہیں موتیوں میں اشکِ حُسنِ یار کو   دونوں آنکھیں اپنی ہیں دو پلّے میزانِ عشق

لکھا ہے کس کے خنجرِ مژگاں کا ہم نے وصف   اک زخم دیکھتے ہیں قلم کی زباں میں ہم

کیا ہے جس نے فکر میں تری سوال اے دوست   ہوا ہے غیب سے آوازۂ جواب بلند

گل و بلبل کی حالت پر بجا ہے گریۂ شبنم   اسے گلچیں کا اندیشہ اُسے صیاد کا دھڑکا

اُلفت جو زلف سے ہے دلِ داغدار کو   طاؤس کو یہ عشق نہ ہوگا سحاب کا

وحشتِ دل کا تقاضہ ہے نکل چلنے کا   تنگ ہوں گنبدِ گردوں کا کہیں در ملتا

بے حجابوں کا مگر شہر ہے اقلیمِ عدم   دیکھتا ہوں جسے ہوتا ہے وہ عریاں پیدا

اس شعر میں جو تحیر سا ہے وہ آتش کی خصوصیت ہے اور اُن کی عظمت کی دلیل ہے اس کی اور مثالیں آگے آئیں گی

ہر گھڑی ہر دم ترقی ہے جمالِ یار کو   روح سے بہتر لطافت میں بدن ہو جائیگا

عذابِ گور سے واعظ نہایت ہی ڈراتا ہے   ہمارے ساتھ ہو نہ زمیں کیا آسماں ہوگا

استادہ دیکھتا ہوں گلستاں میں سرو کو   آزادی میں بھی خو نہیں بدلی غلام کی

اس شعر میں بھی تحیر ہے۔ پہلے شعر کا محرک تحیر تھا اور یہ شعر تحیر کا محرک ہے۔ پہلے شعر میں تحیر سے شاعر متاثر ہوا تھا اور دوسرے میں سامعین۔ آتش کی شاعری اس قسم کے (surprise effects) تحیرات سے مالا مال ہے۔

چند نئے مضامین اور سنیئے :-

یار تو بھولا کرے غمّازہی اے کاش یاد	دوست تو غافل ہوا دشمن کہیں غافل نہ ہو
پرچھا داں ان کا عاشق و معشوق پہ پڑے	برسوں رہا معاملہ روح و تن درست
مدفوں ہیں اس زمیں پہ ہزاروں ہی تاجدار	رکھتا ہے تخت شاہ سر بادشاہ پر
سامنا کرتا ہے کیا اس کا شبستاں میں چراغ	مرد میداں ہے تو نکلے دن کو میداں میں چراغ
خال کا مجھ کو تصور زلف کو میرا خیال	دانہ کی تدبیر میں میں دام میری گھات میں

چاک گریباں کے متعلق بھی کچھ نئی باتیں پیدا کی ہیں :-

چاک ہوگا نہ گریباں ہو جب تک وہ چند	موسم گل میں نہ نکلے گا نہ سنبھار دامن
پڑ رہے بہار میں ہو گریباں تو شکر کر	ہوتی ہے خیر جان کی نقصانِ مال میں
وہ گریباں آگ میں رکھ دیجئے	موسم گل میں جو ہوں بے چاک کے

اسی طرح سبزۂ خط کو نئے طریقے سے شاداب کیا ہے :-

حُسن نے خط غلامی لکھ دیا ہے یار کو	گُل سے گالوں پر نہیں یہ سبزہ کا آغاز ہے
خدا پنہاں ہے عالم آشکارا	نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے
کمر یار ہو گئی غائب	سُن کے دھوم اپنی ناتوانی کی

تخیل کا میدان محض تخلیق مضامین ہی نہیں بلکہ اس کا عمل طرز بیان کی دنیا میں بھی ہے۔ آتش کے یہاں ندرت ادا جدّت خیال کی ہم دوش ہے اس خصوصیت میں صرف غالب ان سے سبقت لے گئے ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

حشر تک ہوئے نہ وہ زلف سیہ آتش سفید	دوں جیسے تشبیہ اپنے نامۂ اعمال سے
مضمون لب خیال رُخ یار میں ملا	پیدا کیا ہے ہم نے یہ لعل آفتاب سے
گوش زد ہوتے ہی ہوئی دشمن	نیند تیری مری کہانی کی
دکھایا آئینہ فکر نے جب صفائے آب درسخن کا	دہن کو جوہر کھلا زباں کا زبان کو عقدہ کھلا دہن کا
شرح بادۂ صف سیہ کاری ہو رنگ رُخ مرا	سامنا ہوتا ہے کہیں کے عفو سے تقصیر کا

ہوں وہ ابتر طفل جس کو جان کھونا کھیل ہے
کنج مرقد ہے گھروندا میری بازیگاہ کا

درماں سے اور درد ہمارا ہوا دوچند
مرہم سے اور سینہ میں ناسور پڑ گیا

ہم چشم تر کو سامنے کرتے ہیں ابر کے
تم ہنس پڑو تو برق کا قصہ تمام ہے

رہی نفرت ہمیشہ داغ عریانی کو جامے سے
ہوا جیسا قطع جامہ پہ ہمارے پیرہن بگڑا

کوتاہ ہے اسقدر مرے تن پہ رداے عیش
ڈھانکوں جو پاؤں کو تو یقیں ہے کہ سر کھلو

ساحل سمجھتے ہیں تہ دریاے عشق کو
طوفان ناخدا ہے ہمارے جہاز کا

سرکشی زیبا ہے ہم دیوانگان عشق کو
خم ہوئی ہے سینکڑوں کانٹوں کی گردن زیر پا

ٹھیک آئی اپنے تن پہ قباے برہنگی
باقی لباس چھوٹے ہوئے یا بڑے ہوئے

رو اس قدر کہ آبرو ابر تر رہے
آتنا نہ ہنس کہ برق کبھی خندہ زن نہ ہو

دل پہ چوٹ اس رخ رنگیں کے نظارہ سے لگی
پھول سے صدمہ پہنچتا ہے مجھے پتھر کا

پاؤں تک تیرے جو پہنچے نہیں اے مایۂ ناز
کف افسوس وہی ہاتھ ہیں ملنے والے

ذہن پہ ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

طریق عشق میں اے دل عصاے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ کسی جا اتار راہ میں ہے

لیکن آتش کے تخیل کی آن بان اور کر و فر ان کی تشابیہ اور شاعرانہ استدلال اور حسن تعلیل میں ملتے ہیں۔ تمثیلات آتش کا اوڑھنا بچھونا ہیں وہ یا تو براہ راست کوئی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں یا ایک شے کو دوسری شے کے آئینے میں دکھاتے ہیں۔ ان کی تشبیہات وافر اور جدید ہیں اور اکثر مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ گل و بلبل والی رسمی تشبیہات ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ تشبیہات کی تازگی اور واقعیت میں ان کا کلام ہماری زبان کے تمام متغزلین پر فائق ہے۔ ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ایک پیراستہ زندان سے ایک کشادہ چمن میں آ گئے۔ آتش کی تشبیہات برعکس بیشتر اردو اساتذہ کے ہمیں زندگی سے دور لیجانے کی بجائے ہم کو عین زندگی کے دھارے پر ڈال دیتی ہیں۔ ان کی اس نوع کی تشبیہات سہل ممتنع ہیں اور سادگی و پرکاری میں سحر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے استدلال او تعلیل کی بھی یہی خصوصیت ہے پہلے ہم تشبیہات کی چند مثالیں پیش کریں گے۔

سختی ایام ہے میرے لئے سامان عیش
خشت بالیں کو سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

کچھ نہ حاصل ہووے کتنی ہی مشقت کیجئے
عتقبا زی کام ہے بیکار کے مزدور کا

چاہے شکستِ جہل تو تحصیلِ علم کر
وابستہ یہ طلسم ہے لوحِ کتاب کا

آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے

کیا حال ہے کسی نے نہ پوچھا ہزار حیف
نالاں رہے جرس کی طرح کارواں میں ہم

لکھا جو ہے جواب خطِ شوقِ یار نے
قاصد کا مثلِ رقعۂ شادی ہے رنگ سرخ

یہ تشبیہ کتنی برمحل ہے "مثلِ رقعۂ شادی"

خونِ دل کے ساتھ ہے لختِ جگر کا انتظار
موئے مژگاں کو ہے شاخِ آسا ثمر کا انتظار

فراقِ یار میں رہتا ہے یوں تصورِ گور
خیال جیسے مسافر کا ہو سرا کی طرف

رہا مثلِ خس و شعلہ مجھے ربطِ اہلِ عالم سے
وہی دشمن ہوا جس کا بنا میں دوستداروں میں

بلبلوں کا نکہتِ گل سے معطر ہے دماغ
غنچے کیا چٹکے ہیں شیشے ٹوٹے ہیں عطار کے

زلف و رخ سے تیرے وابستہ جو ہر مایوس ہے
چشمِ حیرت آئینہ شانہ کفِ افسوس ہے

شوق ہو افشاں چھڑکنے کا تجھیں رخسار پر
تیغ میں ابرو کے پیدا ہو وہیں جوہر سیکڑوں

عالم کو لوٹ کھایا ہے اک پیٹ کے لئے
اس غار میں گئی ہیں ہزاروں ہی غارتیں

اوپر کی تشبیہ کس قدر پردہ بر انداز ہے،

رہا کرتا ہے نظمِ شعر کا سودا مرے سر میں
عروسِ فکر ان روزوں لدی رہتی ہے زیور میں

نازک خیال اب بھی ہیں موجود اے فلک
خالی رہا نہیں کبھی دریا حباب سے

کام ہے اللہ سے دنیا سے کچھ مطلب نہیں
مشتری یوسف کے ہیں خواہاں نہیں بازار کے

حلقہ میں زلفِ یار کے موتی پرو دیئے
دنداں ضرور ہیں دہنِ مار کے لئے

داغِ غمِ عشق کو دل میں جگہ دیجئے
ڈھونڈئیے لے کر چراغ شاہدِ مقصود کو

سینۂ بے معرفت حلقہ ہیں اپنے نہیں
رہ نہیں اس بزم میں مجمرِ بے عود کو

بگولے کی طرح کس کس خوشی سے خاک اڑاتا ہوں
تلاش گنج میں جو سامنے ویرانہ آتا ہے

تماشہ گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

جوشِ جنوں میں دیکھئے پیچھے نہ مڑ کے پھر
منہ جس طرف کو صورتِ دریا اٹھائیے

مذکورہ بالا شعروں میں تشبیہ نے پیرایۂ بیان کو کس قدر پُر زور بنا دیا ہے۔

رُخ سادہ نہیں اس شوخ کا نقشِ عداوت ہو
نظر آتے ہی آپس میں ہر اہلِ انجمن بگڑا

حرصِ ہوا کو سینہ میں غافل جگہ نہ دے
مطلب کو فوت کرتا ہو کیڑا اکتاب کا

اثر پذیر طبیعت بھی شرط ہے آتش
ذکیف مے سے ہوں آنکھوں کی طرح مژگاں سُرخ

جامۂ تن ہوگیا راہِ عدم میں نذرِ گور
بوجھ اُٹھایا تھا مگر تھک کے لئے اسباب کا

لے تپِ غم گور میں لے چل جوانی میں مجھے
دوپہر ہے موسمِ گرما میں وقت آرام کا

مرگیا ہوں جستجوئے کعبۂ مقصود میں
ہے کفن پر میرے عالم جامۂ احرام کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہو اُس کا

اوپر کے شعر میں تشبیہ کی بے ساختگی اور زور حیرت انگیز ہیں۔

برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں
تو اُس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا

مرگئیں تیری جدائی میں ہزاروں حسرتیں
عشقِ غارتگر نے میرے دل کو گورستاں کیا،

ع بیشتر یہی قطعہ گلزار تھا دہ سادہ رو

برنگِ غنچۂ پژمردہ دل گرفتہ ہے
شگفتہ ہوکے نہ دو دن بھی ہم نے یاں کاٹے

چشمِ پُر آب نے تنِ خاکی کو ڈھا دیا
سیلاب کی رسائی ہوئی جب مکاں گرا

کیمیا ہے مہربانی صاحبِ تاثیر کی
مس کیا پارس سے جب آہن طلا ہو جائے گا

فراغ حال ہو دشوار خوش نوایوں کو!
قفس سے تنگ ہے بلبل کا آشیاں ہونا

کرمِ حق سے ہے گلزارِ توکل سرسبز
کٹ کے دریا سے مرے باغ میں جُو آئی ہے

خمکدے میں عالمِ طفلی کی کیفیت ملی
شیر دایہ میکشوں کو خونِ مینا ہوگیا

نکلے نہ پارِ دل جو زباں سے عجب نہیں
چھلکے تو کیا بعید ہے، لبریز جام ہے

دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

گرد ہوا تو اُسے چھوٹنا محال ہوا
دلِ غریب مرا مفلسوں کا مال ہوا

میرے پہلو سے جدا ہوتے ہی ارام ہاں
اُستخواں جو تھا مرے پہلو میں خنجر ہوگیا

ساز کی طرح دبا کرتے ہیں عاشق نالاں
چھیڑ طرفہ یہ ٹھوکے ہر دو جو آتی ہے

کون سا نقشِ قدم چاندی کی تصویر نہیں
اس صنم کو روشِ خامۂ مو آتی ہے

چاہے صفا تو بنا تقہ طہارت کے ذکر کر
پرہیز کر تو تجھ کو دوا کا اثر کھلے

قاتل جزائے خیر تیری تیغ کو
زخموں کے منھ کھلے نہیں جنت کے در کھلے

بلائے جان عالم ہوگئی ہیں تیری زلفیں
قرابت کی ہے مار شانہ نے ضحاک سے پیدا

نکل کے تن سے دکھا دیگی اپنا جوہر روح
کھلے گا مطلب خط جبکہ ہوگا عنواں چاک

صورت برگ خزاں جھڑتے ہیں ہنگام گناہ
جب اٹھاتے ہیں تری راہ میں زوار قدم

بھاگتا ہے اپنی آنکھوں سے خیال رشتۂ یار
کس طرح آغوش میں رکھتا ہے ہالہ ماہ کو

یار آنکھ بھی چرائے تو تابت نہ کر سکیں
چوری کا بادشاہ کے اوپر گماں نہ ہو

صاف ہو ہر چند یہ باطن عزیز دل نہ ہو
کج نما آئینہ ہرگز دید کے قابل نہ ہو

خیال زلف شکیں روح کو قالب میں آفت ہے
مکان تنگ میں کوڑا غضب ہوتا ہے تازی کو

مٹتا نہیں نوشتۂ قسمت کسی طرح
جوہر کبھی نہ خنجر براں سے دور ہو

وہ خط ہے یادگار حسن رفتہ
وہ سبزہ ہے گلستاں کی نشانی

لیکن جیساکہ پہلے کہا جا چکا ہے آتش طبعاً اعتدال سے ناواقف ہیں تشبیہ کی قلمرو میں بھی وہ حسب معمول بے اعتدالی برت کر کبھی کبھی ابتذال کی سرحد میں قدم رکھ لیتے ہیں۔

ہما یہ ہے دونالی بندوق سی وہ بینی
چھرّوں کا کام روئے قاتل کے خال کرتے

یاد ابرو و ذقن میں اڑگئی آنکھوں سے نیند
گر کنواں جھانکا کبھی تلوار کو عریاں کیا

زندہ جاوید ہیں قربانیان تیغ عشق
سر کا کٹنا جانتے ہیں پھوٹنا نکسیر کا

انگشتری کا حلقہ ہے وہ ناف حلقہ دار
خال سیاہ اس میں نگین حدید ہے

عرب نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ تشبیہ سب سے بہتر وہ ہوتی ہے جو مرکب بھی ہو اور متحرک بھی۔ آتش کے مذکورہ اشعار سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی۔ آتش کے یہاں مفرد تشابیہ کی تلاش کافی صبر آزما ثابت ہوگی لیکن مرکب تشابیہ کے لئے ایک سرسری نگاہ سے کام چل جائیگا۔ مرکب تشابیہ رسمیت اور تصنع سے محفوظ رہتی ہیں۔

صورت شمع ہوں ہر چند فروغ محفل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

فغاں کرتا ہوں جب اندام میں رعشہ سا ہوتا ہے
دل دیوانہ کا نالہ ہلا دیتا ہے زنداں کو

چاہئے اشک بھی ہوں نالے کے پیچھے پیچھے
آمد قافلہ ہے بانگ درا سے پیدا

مستِ الست قلزمِ ہستی میں آئے ہیں　　مثلِ حباب اپنا پیالہ بھرے ہوئے

صحرائے تن کی سیر تو مجنوں ذرا کرے　　محمل سوار ہے اُسی گرد و غبار میں

اُترے ہو تم جو غسل کو عالم ہے وجد کا　　دریا اُچھالتا ہے کلاہِ حباب کو

دل کہیں جان کہیں جسم کہیں ہوش کہیں　　اپنے مجموعہ کا ہر ایک ورق برہم ہے

کاروانِ نکہتِ گل کر گیا گلشن سے کوچ　　صورتِ نقشِ قدم گلزار حیراں رہ گئے

بندگیٔ حق میں بھی بھولا نہیں یادِ صنم　　تو بہ مے کی و لیکن داغِ داماں رہ گیا

سعیٔ لاحاصل مداوائے مریضِ عشق ہو　　تھا نا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

رہ جانا پیچھے جسم کا جاں سے عجب نہیں　　کس کارواں کی گرد میں کارواں نہ تھی

استدلال و تعلیل اور تمثیل کی بے شمار فرحت اثر مثالیں ہر صفحہ پر نظر کا استقبال کرتی ہیں

نہ کھایا غصہ کبھی خوانچہ سے قسمت کے　　پھنسے جو حلق میں ہیں وہ نوالہ کیا کرتا

فکرِ رنگیں نے تمہیں مفلس کیا تو کیا عجب　　یہ عروسِ آتش گدا کر دیتی ہے نوشاہ کو

بیڑہ پالا ہے وفتن دشمن ہے خلق اللہ کا　　رہبر و دل کی موت ہے حسن ہو ترنج ناچاہ کا

رنج اُٹھا دے گو رقیب مبتذل محروم ہے　　نعمتوں میں خوان کی حصہ نہیں مزدور کا

جوشِ وحشت ہے پئے قطعِ تعلق مقراض　　سگِ دیوانہ کو پایہ نہ دیکھا دور کا

نیش زن کو اپنی دولت سے نہیں ممکن فروغ　　کب ہوئی روشن بیانِ خانۂ زنبور شمع

سودا رہے گا سر کو بہت روئے یار کا　　مدت کے بعد مٹی میں ہوتے ہیں بال خاک

حیف ہے سوزشِ دل کا نہ ہوا اشکوں سے علاج　　پیشتر ورنہ پسینے سے اُترتی نیند ہے

تشبیہات کی طرح آتش کے استدلال کا خام مواد روزمرہ کے واقعات ہیں۔ ہماری قدیم شاعری کی مصنوعی فضا میں واقعیت اور سادگی کے یہ مظاہر بہت ہی موثر ثابت ہوتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ دریچہ کھل گیا اور تازہ ہوا کا ایک جھونکا تیزی کے ساتھ گذرتا ہوا چلا گیا۔ اردو شاعری میں عموماً اور لکھنؤ کی شاعری میں خصوصاً ان اشعار کی حیثیت بمنزلہ نخلستان کے ہے

قریبوں سے نہ رکھ امداد کی اُمید مشکل میں　　نکالا ناخن پا سے کہاں خار کفِ پا کو

بھاں خالی نہیں رہتا کبھی ایذا دہندہ دل سے　　ہوا نا سور تو پیدا اگر زخم کہن بگڑا

جوشِ اشک آتش کا باعث آہِ سرد ہے — گرم کرتی ہے ہوا جاڑے کی پانی چاہ کا

بشر کو بعدِ نعمت کے ہے ہوتی قدرِ نعمت کی — غنیمت جانتا ہے لنگ اپنے پائے چوبیں کو

خام کو شادی ہے، غم پختہ کو ہے احسان سے — کشت کو نفع ہے خرمن کو ضرر باران سے

امن میں رکھتی ہے شورِ فتنہ سے روشن دلی — چور بھی جاتا ہے گھر میں دیکھ کر روشن چراغ

حالتِ بد میں نہیں کوئی کسی کا آشنا — کوچ کر جاتا ہے چشم از مردنِ بیمار خواب

دل منور ہے خیالِ رخِ نورانی سے — پرتوِ ماہ سے رہتی ہے یہ تمیر سفید

ضبط گریہ سے جلا کرتی ہیں آنکھیں سچ ہے — بند ہونے سے ہے ناسور کا بہنا بہتر

آتشِ جوش میں کیا آنسوؤں کو روکے گی — ٹھیر سکتا ہے کہیں آ کے سیلاب میں بند

غیر ممکن ہے اسیری میں شگفتہ خاطری — دل نہ قیدی کا لگے گو باغ ہو زندان میں

طفلی سے اور فہم ہوا وہ شباب میں — تابش ہو دوپہر کو فزوں آفتاب میں

عجب نہیں ہے جو اہلِ سخن ہوں گوشہ نشیں — کہیں دہاں میں زباں کا مکاں نہیں معلوم

خود غلط ناحق نہ ہوں تقلیدِ آتش سے ہلاک — چور کب منصور بن سکتا ہے کھینچ کر دار پر

اوپر کے شعر میں بھی پرانی تلمیح کو نئے مضمون میں استعمال کیا ہے۔

جو کامل ہیں نہیں اندیشۂ آتش انکو بدبیں کا — دہانِ زخمِ کاری خندہ زن ہے چشمِ سوزن پر

اس شعر میں استدلال بھی ہے اور حسنِ تعلیل بھی

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

رفیقِ حال بُرے وقت میں نہیں کوئی — شریکِ جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں

عشق کامل ہے سبب حسن سے یکرنگی کا — شمع و پروانہ کا مل جانے میں اک مذہب ہو

خلافِ وضع ہے انساں کے واسطے معیوب — بدن کو زیب نہ دیوے کبھی قبا اُلٹی

مندرجہ بالا شعر سے واضح ہو گیا ہوگا کہ تمثیلی استدلال کسقدر کارگر ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ استدلال منطقی استدلال کی بہ نسبت ناقابلِ اعتبار ہے تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ منطقی استدلال بہ دقت ایک بات کو سمجھاتا ہے اور تمثیلی استدلال اُسے بکلفت منوا لیتا ہے۔ تمثیل شعریت کی ضامن ہے اور منطقی تعلیل اُس کی ضد۔ تمثیلی استدلال کی اعلیٰ ترین مثالیں صرف شاعر کے یہاں ملتی ہیں اور وہ خود ثبوت ہیں اس کلیہ کا کہ شاعر کی نگاہ بظاہر متبائن و متغائر اشیا و امور میں مشابہت دریافت کر لیتی ہے۔ اُلٹی قبا یہ ایک

مادّی اور مرئی شئے ہو خلاف وضع روش ہے جو غیر مادّی بھی ہے اور غیر مرئی بھی۔ آتش کی نگاہ مرئی اور غیر مرئی کے امتیاز کو مسمار کرتی ہوئی دونوں کو یکجا دیکھتی ہے۔ اس سے بہتر پیرایہ خلاف وضع کو مضحکہ خیز بنا کر دکھانے کا، متصور نہیں ہو سکتا۔

یاد آنکھ بھی چرائے تو ثابت نہ کر سکیں چوری کا بادشاہ کے اوپر گماں نہ ہو

بشر کو بعد نعمت کے ہے ہوتی قدر نعمت کی غنیمت جانتا ہے لنگ اپنے پائے چوبیں کو

یہ گردش فلک پیر سے ہو اتنا بت قوی ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری

رفع حجاب یار کیا آہ سرد نے کھولے نسیم صبح نے بند قبائے گل

ماتم دریا دلاں شادی تنک ظرفوں کی ہے گریۂ مینا ہے باعث خندہ ہائے جام کا

اثر پذیر طبیعت بھی شرط ہے آتش نہ کیف مے سے ہوا آنکھوں کی طرح مژگاں کو رنج

عہد طفلی ہی سے ہے مشق تواضع لازم حلقہ آسانی سے بن سکتا ہے چوب تر کا

آتش کی تشبیہات اور تمثیلات کے جادو کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ اکثر امور اور اطوار کو اشیا سے مماثلت دیتے ہیں جس قدر مشبہ اور مشبہ بہ میں مغایرت اور بُعد ہوگا اسی قدر تمثیل زیادہ جاندار اور دیرپا اثر ہوگی۔ اس کی ایک مثال بھی اوپر کا شعر ہے۔

عہد طفلی ہی سے ہے مشق تواضع لازم حلقہ آسانی سے بن سکتا ہے چوب تر کا

حسن تعلیل ہماری شاعری کے ان چند صنائع میں سے ہے جس کی شعریت میں کلام نہیں۔ یہ صنعت آتش نے بڑی خوبی سے استعمال کی ہے اور اس میں بھی حسب معمول گرد و پیش کی چیزوں حتّٰی کہ اعضائے جسم تک سے استفادہ کیا ہے۔

یہ گوش ہی ہیں کہ باتیں زباں کی سنتے ہیں نکل گئے ہیں دہن میں سے ہو کے دنداں تنگ

شب کی شب میں ہوگئی اس مرتبہ دلبستگی صبح کو شبنم گئی روتی ہوئی گلزار سے

ضعف پیری سے نہیں ہوتا ہے قد انساں کا خم توڑتی آخر کو عبرت آغوش ہے

صف مژگاں کی جنبش نے غبار خط کیا پیدا نمود گرد کی بنیاد ہے تحریک لشکر سے

شب و روز اسکو رقص شادمانی میں ہے پاتا ہوں حصار عافیت گرداب نے سمجھا ہے دریا کو

دریا میں ایک روز نہانے گیا تھا یار اس دن سے آب تک آنکھوں میں جان حباب ہے

روتے روتے پہلوئے گل میں گزر جاتی ہے رات یاد آتا ہے جو شبنم کو کنار آفتاب

مے سے کرتا نہیں لبریز اسے تو ساقی قالب جام میں یہ روح سبو آتی ہے

صید اسے مدعی تھا پھر ہے برق اندازی شکار کھیلنے طاؤس کا سحاب آیا

تو علم چاہے تو ہو اہلِ علم کا پیرو   کمرے زلف کو انداز پیچ و تاب آیا
اندیشۂ بہار سے رنگِ خزاں ہے زرد   دہشت لگی ہوئی ہے اسے انتقام کی

مشاہدات اور واقعات کی طرح آتش کے کلام میں دیسی مواد بھی تشبیہ و استدلال کے چور دروازہ سے داخل ہوگیا ہے۔

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی   کیا کیا جلا ہے ساکھو پھولا جو ڈھاک بن میں
مست ہاتھی ہے تری چشم سیہ مست اے یار   صفِ مژگاں اُسے گھیرے ہوئے بھالوں سے

آتش کی تشابیہ ان کی اپنی ہیں، ان کی غیرت یہ کب گوارا کرتی کہ "مردے کے مال" کی گاہک بنے۔ ان کی تشابیہ استدلال اور تمثیلات کا حُسن ایک طرف ان کی تازگی میں ہے تو دوسری طرف ان کی سادگی میں

وحشت آباد جہاں میں نہ کر آرام طلب   کب مسافر کو ملا چین دہ ویران سے
پست فطرت کو نہ ہو رتبۂ اعلیٰ حاصل   ایک تہ خانہ کو دیکھا نہ بلند ایوان سے
امن چاہے تو نہ رکھ عالمِ اسباب سے کچھ   ہاتھ آتا ہے کفن دزد کو کیا عریان سے
کرم حق سے ہوں ایمن ستم دوراں سے   پالے کا ڈر نہیں رہتا اثر باراں سے
جام میں قطرۂ مے لب نہ مرے چھوڑ ینگے   مال کشتی کو کیا کرتے ہیں ساحل خالی
بدسرشتوں کو نہ نیکوں کا اثر ہو ہرگز   صحبتِ گل سے نہ ہو دیں کبھی خوشبو کانٹے
دیکھتے ہی انھیں تلوے مرے کھجلاتے ہیں   اے جنوں جانتے ہیں کیا کوئی جادو کانٹے

مندرجہ بالا شعر میں یہ حیرت آمیز استفہام کس قدر سادگی لئے ہوئے ہے۔ آتش کا دماغ تشبیہوں اور مثالوں کے سہارے چلتا ہے، وہ علت و معلول کے سلسلہ سے بے نیاز ہے۔ خواہ وہ کسی شے کا حُسن و قبح بیان کر رہے ہوں یا کسی امر کا تجزیہ کر رہے ہوں وہ بغیر تمثیل کے زیادہ دُور نہیں چل پاتے۔ وہ کسی وصف کو اُس وقت تک ماننے کے لئے تیار نہیں جب تک وہ وصف کسی دوسرے وصف یا کسی دوسری شے کے مماثل نظر نہ آئے۔ وہ ہر شے کا عکس آئینے میں دیکھتے ہیں۔ آتش خواہ کوئی واقعہ بیان کریں اُسے مثال کو ضرور سمجھائیں گے۔ مثال سے نہ صرف توضیح اور نمایاں ہوتی ہے بلکہ بات میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے اور بیان میں زور آجاتا ہے

معدوم جوشِ گریہ سے کیا ہو غبارِ دل   کچھ گرد تو نہیں ہے جو باراں سے دب رہے
فکرِ درماں جو کروں درد دگر پیدا ہو   منقش خار سے ہو پاؤں میں سوزن ٹوٹے

اعضائے جسم سے تمثیل آتش کی خصوصیت ہے۔

عزلت گزیں کو عیب لگاتی ہے سرکشی   دنداں وہ بدنما ہے کہ جو زیرِ لب رہے

تحیّر کی ایک اور مثال لیجئے :۔

پڑھ سکتا سر نوشت کا مطلب کوئی نہیں — معلوم کچھ نہیں کہ یہ خط کس زباں میں ہے

تشبیہات

موجودہ مغربی تنقید نے تشبیہات مکرر (Iterative Imagery) سے بڑی مدد لی ہے، یعنی کسی شاعر یا مصنف کے یہاں ایک ہی تمثیل یا تشبیہ یا لفظ کی تکرار سے نقاد اُس کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کر لیتا ہے۔ اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر کے تحت الشعور میں کیا کیا خیالات کارفرما تھے جنھیں اُس کے شعور نے صاف ظاہر نہیں ہونے دیا۔ شاعر کے خلوص کے پرکھنے کے لئے یہ ایک مستند کسوٹی ہے اور اس کے مافی الضمیر کو سمجھنے کے لئے بہترین وسیلہ، علاوہ بریں نظم کے ماحول اور تاثیر کی تعمیر میں بڑا حصہ ان ہی الفاظ اور تشبیہوں (Images) کا ہوتا ہے جنھیں شاعر غیر ارادی طور پر بار بار استعمال کرتا ہے (Iterative Imagery) کا استعمال آتش کے کلام میں کافی نمایاں ہے۔ اُردو کے ہر شاعر سے زیادہ آتش دنیا کو ایک سرائے سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا، جیسا کہ ماقبل کے اشعار سے اندازہ ہو گیا ہوگا، ان کے یہاں جابجا جادۂ منزل، قافلہ و درا کی تکرار ملے گی اس طرح گور اور مرگ کا ذکر بھی بار بار آتا ہے۔ تن اور روح کو وہ الگ الگ دیکھتے ہیں اور ان کے عارضی اتحاد کو وہ کوئی وقعت نہیں دیتے۔

خرابی سے ارادہ ہے مکاں تعمیر کرنے کا — گرا کر قصرِ تن کو گور کی منزل اٹھانی ہے

قالب کی طرح روح دکھائی نہیں دیتی — پنہاں یہ مسافر ہے عیاں گردِ سفر ہے

اشتیاقِ گور بھی دیتی ہے ایذا طولِ عمر — منزلِ مقصود کی دوری سفر میں داغ ہے

کوچ کا احساس ایک آن اُن سے جُدا نہیں ہوتا، لہٰذا حرکت سے متعلق الفاظ اور نقوش کی آتش کے یہاں فراوانی اور ان کا استعمال ان مضامین میں بھی ہے جہاں ان کا گمان بھی نہ ہو

چاہیئے اشک بھی ہوں نالہ کے پیچھے پیچھے — آمدِ قافلہ ہے بانگِ درا سے پیدا

اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود ترکِ دنیا کی تلقین کے ان کے کلام سے دل کبھی نہیں بجھتا۔ اس شعر سے ان کی یہ مابہ الامتیاز خصوصیت واضح ہو جائے گی ؂

ساری رونق ہے یہ دیوانوں کے دم کی آتش — طوق و زنجیر سے ہوتا نہیں زنداں آباد

فانی مرحوم کا ایک بہت اچھا شعر زنداں کے متعلق ہے

بہار آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے — یا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

یہ طبائع کا اختلاف ہے، آتش کے یہاں باوجودیکہ دنیا بیزاری کے اشعار بہت ہیں، یاس کا گذر نہیں۔ ان کی ہر غزل سے مترشح ہوتا ہے کہ قبائے ہستی کبھی ان پر چست نہیں رہی اور اس زندگی اور اس کے علائق کو ان کی آزاد اور بلند فطرت باوجود اشتعال کے نظر تحقیر سے دیکھتی رہی

اس بند و بست جسم سے ہو جاں کو نجات ہو — چھوٹے پری طلسم عناصر شکست کھائے
اس مشغلہ سے اسے خاک نہ ہوگا حاصل — جاں عبث جسم کی بیگار لئے پھرتی ہے
ہیں لئے جھاڑتے ہیں گرد پیرہن غافل — نہیں سمجھتے کہ ہے تیرا پیرہن مٹی
جہاں چاہے بسر اوقات کر چار دن بلبل — چمن میں آشیانہ ہے قفس صیاد کے گھر میں

جسم اور دنیا کے لئے آتش نے اکثر تحقیر آمیز تشابیہ اور علامتیں استعمال کی ہیں۔

ڈھونڈے اور مجرد کوئی زال دنیا — میری پاپوش کے قابل نہیں مردار کی شکل
عزیز روح کے دم تک ہے کالبد گل کا — خراب حال ہو جب مغز جب ہو اچھلکا
تنگ آکر جسم کو اے روح چھوڑا اچھا ہو — طفل طبعوں کے لئے مٹی کا گھوڑا اچھا ہے
برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو — نہ بوئے کافور میں نے سونگھی نہ داغ مجھ کو لگا کفن کا
نفس شقی بھی روح کے ہمراہ تن میں ہے — یوسف کے ساتھ گرگ بھی اس پیرہن میں ہے
ایذا میں روح ہے تن خانہ خراب سے — پائے سمند الجھا ہوا ہے رکاب سے

اس شعر سے ان کی اور خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے جس کے متعلق آگے چل کر بہت کچھ کہنا ہے، یہ ان کا سپاہیانہ انداز کلام ہے ان کے قلم اور ان کی تلوار میں زیادہ فاصلہ نہیں۔ آتش قلم اٹھاتے ہیں تو اس تیور سے گویا شمشیر کا وار کریں گے۔ سپاہیانہ زندگی سے انھوں نے استدلال اور تشبیہ میں اکثر مدد لی ہے۔ آتش کو اپنی انفرادیت کا شدید احساس تھا! اس کے ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ زال دنیا ان کی توجہ کے لائق نہیں۔ ایسی تنہائی کا وہ شکوہ تو کرتے ہی ہیں اس پر نازاں بھی ہیں

اس گلشن ہستی میں ہیں وہ گوشہ نشیں ہم — دن رات رہا مثل حباب اپنا مکاں بند
نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا
متصل نالوں کی آواز چلی آتی ہے — جسم خاکی قفس مرغ گرفتار نہ ہو
شجر قدس ہیں ہم عالم میں — اس چمن میں نہیں پیوند اپنا

ان مضامین کو بیشتر شعرا نے باندھا ہے لیکن زور و جوش میں کوئی آتش کو نہیں پہنچ سکا۔ دنیا کی بے ثباتی ان کے لئے

لفظی روایت نہیں۔ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ روح اور جسم کا تعلق ان کی نظر میں شاعرانہ استعارہ نہیں بلکہ ایک ایسی قید ہے جس کی شدتیں ان کا ہر نفس محسوس کرتا ہے۔ توکل اور قناعت آتش کی رگوں میں جاری و ساری ہیں۔ یہ دائم الوقت خوش عقیدگی پر مبنی نہیں۔ کیا یہ قلندر کا نعرہ نہیں ؎

کام رہنے کا نہیں بند اپنا بندہ پرور ہے خداوند اپنا

لیکن اس کی مزید مثالیں آگے آئیں گی۔ اور غایت اظہار کی بنا پر انھیں زیادہ وقت بھی نہ دیا جائے گا۔ اوپر کی گفتگو سے غالباً یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ آتش کے یہاں محض جذبہ جوش نہیں فکر و تخیل بھی ہے۔ ان کے تخیل کی آہٹ ان کی تشبیہات اور تمثیلات اور طرز بیان اور استدلال میں جا بجا ملتی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے تخیل کو زمانہ کی فضا نے گمراہ کر دیا۔ وہ تخیل جو مضامین نو کے انبار لگا دیتا اکثر رعایت لفظی کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گیا۔ اُنھوں نے چند فرسودہ مضامین مثلاً پنجۂ مرجاں، ماہِ کنعاں، چاہِ ذقن یوسف و زلیخا، سیب زنخداں وغیرہ کو بار بار نئے رنگ سے باندھا ہے مگر بوسیدہ کپڑوں کو زردوزی سے کیا حاصل۔ لیکن یہی پابندیاں بتاتی ہیں کہ ان کا تخیل کس قدر اعلیٰ تھا جو ان شدائد سے جانبر نہ ہو سکا۔ اور تخیل کی گمراہی سے بھی تخیل کا وجود تو ثابت ہوتا ہے۔ اس سے انکار کرنا بے سود ہوگا کہ تشبیہات کی فراوانی اور تازگی اور سادگی میں آتش اُردو کے ہر شاعر پر فائق ہیں۔ آتش نے ہمارے جدید شاعروں سے صدیوں پہلے فرسودہ ایرانی تشبیہات کو ترک کر کے مشاہدہ کی روشنی میں نئی نئی تشبیہات پیدا کیں۔ اور لطف یہ کہ غزل جیسی قدامت پسند صنفِ سخن میں انھیں سمو دیا۔ ایک اور مثال یاد آ رہی ہے ؎

چیر کر پہلو کیا قاتل کے خنجر نے کرم اپنے گھر میں آیا مہماں توڑ کر دیوار کو

آتش کے تخیل کا ایک مصرف تضاد بھی ہے جو کثیر ہے اور کبھی کبھی لطیف بھی

آتش یہی دعا ہے خدائے کریم سے محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا
پھنس کے اس میں مرغ جاں تا روزِ محشر جال سے اپنی اُلجھی ہوئی زلفِ پریشاں حال سے
کہوں کیا ہوئی عمر کیوں کر بسر میں جاگا کیا بخت سویا کیا
آزردہ ہیں وہ بوسۂ لب کے سوال پر شیرینی کے لئے ہے نمک خوار سے بگاڑ
یہی جو آتش حسن بتاں کی گرمجوشی ہے جلا ہندو کے مُردہ کی طرح زندہ مسلماں کا
خار کا کھٹکا نہیں رکھتے ہیں ہم آتش با قدم موم ہو جائے اگر آ جائے آہن زیر پا

یہ تضاد دماغی ورزش نہیں صدائے قلب ہے سطحی نہیں۔ احساسات سے لانیفک ہے اس کا ماخذ جسم و جاں کے تضاد کا شدید احساس ہے۔ اسی سے آتش کی ایک دوسری بنیادی خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی انتہا پسندی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ آتش

کے یہاں اعتدال کا فقدان ہے، وہ روح کے پرستار ہیں۔ جسم کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سے کوئی معاہدہ انھیں گوارا نہیں ان کے یہاں صرف دو رنگ ہیں۔ سیاہ اور سفید اور یہ بالترتیب جسم اور روح کی نمائندگی کرتے ہیں، کوئی شک نہیں کہ اس احساس نے ان کے کلام میں جوش و خروش کی تقویت کی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی کے باعث آتش کے کلام میں مفکر شاعری کی پختگی، اعتدال اور توازن نہیں ملتا۔ علاوہ بریں چونکہ وہ صرف سیاہ اور سفید میں امتیاز کر سکتے ہیں اس لئے ان کی قوت تمیز کی دھار کند ہو کر رہ گئی ہے۔ سفید اور سیاہ کے بیشمار امتزاجات اور دوسرے رنگوں کے باریک فرق ان کے لئے وجود نہیں رکھتے۔ اسی لئے ان کے یہاں پیچیدگیاں ہیں نہ چھپی ہوئی لہریں، کنایہ کا گذر بھی کم ہے

اس گفتگو سے بڑی حد تک اس رائے کی تردید ہو گئی ہو گی کہ آتش کے یہاں صرف جذبات ہیں خیالات نہیں۔ آورد سے ان کے کلام کو کوئی علاقہ نہیں وہ محض آمد ہے۔ قطع نظر اس کے کہ آمد اور آورد کی یہ تفریق بھی سطحی اور غلط ہے۔ آتش کے یہاں شعر کبھی ہتھیار بند نہیں کودتا وہ ... الفاظ کے دروبست پر کاتی تو یہ صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں

بندش چست سے نری آتش — قافیہ تنگ رہا کرتا ہے

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کی یہ تعلی بیجا نہیں، ان کے کلام میں جو زور و جوش پایا جاتا ہے۔ وہ ان کی آزاد طبعی کے علاوہ کہنہ مشقی کا نتیجہ بھی ہے سوائے ان غزلوں کے جو زود گوئی یا بزم گوئی کا عالم کر رہی ہیں آتش کے یہاں کہیں خلا، کھانچا، یا ڈھیل ڈھال نہیں ملے گی جس غزل پر انھوں نے تھوڑی سی توجہ بھی صرف کی ہے اس میں بندش کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی۔ قابل داد آرٹ وہ ہے جو خود کو چھپا لے، دوسرے بلند پایہ شعرا کی طرح آتش کے وہ اشعار جنھیں ہم سراسر آمد سمجھتے ہیں ذہنی ردّو بدل اور ہر دو منی جد و جہد کے بعد اپنے موجودہ قالب میں آئے ہیں۔

ان کے قلندرانہ اشعار کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کا نظریہ حیات ہر چند اقبال کے نظریۂ حیات سے بہت مختلف تھا تاہم اس خصوصیت میں وہ اقبال کے ہراول ہیں۔ اور بعض مقامات پر ان کا جوش و خروش اقبال کی دسترس سے باہر ہے۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

اللہ کے فقیر کا دل کیوں نہ ہو غنی — تکیہ ہے کیسے حاجت مسکیں نواز کا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں — صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جام جم پایا

عاجز نواز دوسرا تجھ سا نہیں کوئی — رنجور کا انیس ہے ہمدم علیل کا

باغ و بہار آتش نمرود کو کیا — مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا

موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی | فرعون کو تو نے غرق کیا رود نیل کا
طوفاں میں ناخدائی کشتی نوح کی | حقا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا | نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا
تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوارا ہے | زمانہ میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

یہاں پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ آتش کے یہاں تصوف محض رسم شعر نہیں لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ آتش نے سلوک کے مراحل طے کئے تھے۔ ان کا ہر بن مو "اس بند و بست جسم" سے نالاں تھا اور ان کی روح بازگشت کے لئے بیتاب، ان کے متصوفانہ اشعار اسی احساس پر مبنی اور اسی خیال کے نتائج ہیں۔ انھوں نے طریقت کے مقامات اور اس کی تفصیلات سے کہیں بحث نہیں کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے تصوف کے اشعار ہماری شاعری میں منفرد ہیں۔ یہ ایک رند سرمست کا تصوف ہے۔ میر درد کا مکمل تصوف نہیں اور نہ غالب کا محض خیالی تصوف۔

مست الست قلزم ہستی میں آئے ہیں | مثل حباب اپنا پیالہ بھرے ہوئے
یہ جانا پہنچے جسم کا جاں سے عجب نہیں | کس کارواں کی گرد ہیں کارواں نہ تھی

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا | ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا
گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش | بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا
گریاں ہے اگر شمع تو سر دھنتا ہے شعلہ | معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اس کا
وہ شوخ یہاں گنج کی مانند ہے اس میں | معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اس کا
جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اس کی | جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اس کا
دل قصر شہنشہ ہے وہ شوخ اس میں شہنشہ | عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اس کا
وہ یاد ہے اس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو | حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اس کا
یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے | قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اس کا
آوارگی نکہت گل ہے یہ اشارا | جامہ سے جو باہر ہوا دیوانہ ہے اس کا
بے حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا | آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اس کا
شکرانہ ساقی ازل کرتا ہے آتش | لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

یہ غزل نہ صرف آتش کے تصوف کی ایک مثال ہے بلکہ تسلسل خیال کا ایک اعلیٰ نمونہ۔ مسلسل غزلوں میں آتش غالب کے پیشرو ہیں

اس قسم کی مسلسل غزلیں نہ صرف لکھنؤ اسکول بلکہ اردو شاعری کے لئے ایک نئی چیز تھیں۔ اس میں آتش کے قصد و اختراع کو دخل نہیں وہ جہاں زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ تسلسل ہمرکاب ہو جاتا ہے۔ آتش کی یہ غزلیں زمانہ اور شعریت دونوں کے لحاظ سے مقدم ہیں۔ وہ غالب کی مسلسل غزلوں ع مثلاً بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے - ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے - وغیرہ سے کسی پہلو سے کمتر نہیں اور زور اور جوش میں اکثر ان پر فائق۔ پُر جوش مربوط غزل نے ان سے آگے ابھی تک کوئی قدم نہیں بڑھایا۔ یہ غزلیں پڑھ کر ذہن خود بخود حافظؔ اور رومیؔ کے ترانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ دو ایک اور مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔

ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہسوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

طریق عشق میں اے دل عصائے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ کسی جا اتار راہ میں ہے

سمند عمر کو اللہ رے شوق آسائش
عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق اپنے ساتھ
فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے

تلاش یار میں کیوں ڈھونڈئے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے

جنوں میں خاک اڑاتا ہے ساتھ ساتھ اپنے
شریک حال ہمارا غبار راہ میں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

کوئی تو دوش سے بار سفر اتاریگا
ہزار راہزن امیدوار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائینگے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

بلائے جان مسافر ہے خواب شیریں بھی
یہی وہ شہد ہے جو زہر بار راہ میں ہے

ٹھٹکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

یا وہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں

یا آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
چہرۂ شاہد مقصود عیاں ہے کہ جو تھا

یا شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

یا یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

دلِ شہیدِ رہِ داماں نہ ہوا تھا سو ہوا
ٹکڑے ٹکڑے یہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا

یا
سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

یا
دل چھٹ کے جانبِ گور کی منزل پہنچ گیا
کیسا رفیق ساتھ سے مشکل میں رہ گیا

آتش کی اس قبیل کی غزلیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اس جادہ سے جو ان کی فطرت کے عین مطابق تھا انحراف کیوں کیا اور اپنے اوپر لایعنی بندشیں جن کی اہمیت گورکھ دھندوں سے زیادہ نہیں، کیوں عائد کرلیں۔ ان کی شاعری کے لئے یہ مضر تھا کہ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے لیکن ہماری شاعری کے لئے مفید۔ اگر وہ دہلی میں پیدا ہوتے تو اردو ادب کو ایک ایسا شاعر میسر آجاتا جو زور و جوش کے علاوہ تخیل میں غالب کا ہمسر ہوتا لیکن لکھنؤ کی زمین بالکل بنجر پڑی رہتی۔ آتش نے لفظوں کے استبداد کی ایک حد تک مدافعت کی اور زلف و شانہ کے گرفتاروں کو بلند اخلاقی مضامین، آزاد روی اور قناعت مشربی سے روشناس کیا غرضکہ لکھنؤ اسکول کو نجات اور بقا دینے والے آتش ہی ہیں۔ اور ان ہی کی مساعی نے انیس و دبیر کے لئے میدان صاف کردیا۔ دراصل ہماری شاعری میں آتش آزادگی کا حرفِ آخر ہیں

نہ تو دشمن کوئی میرا نہ کوئی میرا دوست
بارِ خاطر نہ کسی کا نہ غبارِ دامن

دل نہ جہاں میں کسی چیز کا خواہاں ہوا
سیر ہی کو ہم مگر آئے تھے بازار میں

بحرِ الفت میں تباہی کا ہے اندیشہ کسے
ناخدا جو نہیں رکھتے وہ خدا رکھتے ہیں

داغِ دل کی روشنی ہے بوریائے فقر پر
شیر کی چربی سے جلتا ہے نیستاں میں چراغ

حریف اپنی تنک ظرفیوں کا کام نہیں
خمِ فلک سے کم اس میکدہ کا جام نہیں

تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوار ہے
زمانہ میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

صحرا کو چلو چاک گریباں کرو آتش
لنگر نہیں ہیں پاؤں نہ پتھر کے تلے ہاتھ

ہوش و خرد ہیں باعثِ تکلیف آدمی
دیوانہ آشنا نہیں دامن کے بوجھ سے

نیرنگِ روزگار سے ایمن ہیں شکلِ سرو
رکھتے ہیں ایک حال بہار و خزاں میں ہم

پیدا ہوا ہے اپنے لئے بوریائے فقر
یہ نیستاں ہے شیر ہیں اس نیستاں میں ہم

خواہاں کوئی نہیں تو کچھ اس کا عجب نہیں
جنسِ گراں بہا ہیں فلک کی دکاں میں ہم

کیا جو اجڑے دل کو آ جلا یہ دل رکھو گا
ادھر سے آپ تو جاد دِ فلک پیر سفید

چھوڑنا تیشے سے اپنا سر نہ تھا اے کوہکن
چھیننا شیریں کا تھا پرویز کا سر توڑ کر

غم عالم ہے شکار دلِ شوریدہ مزاج
میرے پہلو میں کیا سینۂ بیتاب نہ تھا

توڑتا پاؤں کو جو تخت کی خواہش کرتے
کاٹتا سر کو اگر پائے افسر ہوتا

فقیری سلطنت ہے خاکسارِ کوچۂ جاناں کی
مبارک جام ہو جمشید کو خاتم سلیماں کو

تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوارا ہے
زمانہ میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو
نہ ہوئے کافور بینی سوگھنی داغ مجھ کو لگا کفن کا

اوپر کے شعر سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ آتش ملائق دنیا کو کس تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنے گرد و پیش دنیا کے پیاروں کو دیکھ کر وہ گھبراتے تھے۔ وہ عالم اسباب میں خود کو اجنبی محسوس کرتے رہے اور خود کو ہمیشہ عوام کے گلہ سے علیحدہ سمجھا کئے۔

مثلِ شبنم ہوں صاف دل قانع
مجھ کو دریا ہے بوند پانی کی

ہوش و خرد ہیں باعثِ تکلیف آدمی
دیوانہ آشنا نہیں دامن کے بوجھ سے

عقل کے استبداد کے خلاف ہماری شاعری میں سب سے پہلے آتش نے احتجاج کیا اور آتش کے بعد اقبال نے

ہمیشہ جھاڑتے ہیں گرد پیرہن غافل
نہیں سمجھتے کہ ہے زیر پیرہن مٹی

بلاغت، تاثیر، تازگی، اور پردہ براندازی میں ایسے شعر کم ہوں گے جو مذکورہ بالا شعر کے ہمپایہ شمار کئے جا سکیں

کون سی شے ہے زمانہ میں نہیں جو اس پر
سیر کر دل ہی میں دنیا کا تماشہ سب ہے

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

ہستی کی اسیری سے بہتر رہتے ہیں سدا تنگ
چھوٹے تو ادھر پھر کے نہیں تکنے والے

جس قدر نفرت ہے اس سے مجھ توکل پیشہ کو
اس قدر ہو گی نہ قاروں کو محبت زر کی ساتھ

انفرادیت کا احساس آتش کے بیشتر اشعار میں شدت کے ساتھ ملے گا۔ اسی احساس نے ان سے تفاخر میں پُر زور اشعار کہلوائے ہیں ان کے دعاوی محض ڈینگ نہیں اور مبالغہ کے باوجود گراں نہیں گذرتے۔

برق رفتار ہوں منزل ہے میرے زیر قدم
ابر گھیرے مجھے ہرچند کہ باراں روکے

آبلے پاؤں کے کیا تو نے ہمارے توڑے
خارِ صحرائے جنوں عرش کے تارے توڑے

لنگ ابلقِ ایام نہ ہو مار کے ٹھوکر
ہے سخت مرا کاسۂ سر سُم سے زیادہ

مجھ کو لغزش نہ ہو ہر چند زمانہ ہل جائے — قطب تارہ جسے کہتے ہیں مرا کوکب ہے

آتش کے قلندرانہ اشعار میں کہیں آزادی طبعی ہے، کہیں تفاخر، کہیں توکل، کہیں استغنا، کہیں تحقیر دنیا، اور کہیں غیرت اور کہیں یہ سب ملے ہوئے۔ غیرت بھی ہماری رسمی غزلیات کے لیے ایک نئی چیز تھی جس نے شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کا مرتبہ بلند کر دیا۔

بلند ہو نہ زمیں سے جیوا مزار آتش — نشان قبر سے منظور مجھ کو نام نہیں

عجب نعمت عطا کی ہے خدا نے اہل غیرت کو — عجب یہ لوگ ہیں غم کھا کے دل کو شاد کرتے ہیں

عزت نالہ و فریاد نہ کھو اے آتش — آشنا کوئی کہیں کون خبر لیتا ہو

وغیرہ۔ چند شعر اور ملاحظہ کیجئے اور پھر ہم آگے بڑھیں گے

گو رہیں یکا اہل دنیا سے — خلوت اس انجمن سے بہتر ہے

نہیں کھٹکا کسی طرح سے پھر — جیب پوشی کفن سے بہتر ہے

پیدا کریں جو تجھ کو انہی کو ہے دسترس — یا مرد ہیں وہی جو تری جستجو کریں

پھر دسا زندگانی کا نہیں کچھ — کفن سے رکھے لے آتش شہر مول

آتش کے قلندرانہ انداز کا ہر کاب ان کا سپاہیانہ طرز بیان اور مشرب ہے لکھنؤ کی شاعری کے تصنع، تقلید اور نسائیت کے خلاف یہ ایک بڑا احتجاج تھا۔ لطف یہ ہے کہ ان مضامین کے لئے بھی جنہیں سپاہیانہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے اسلوب بیان آتش اکثر اسی کو جا بجا اختیار کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عاشقانہ اشعار میں بھی

ہجر کے صدمے سے خوبی عشق کی ظاہر ہوئی — زخم کی ایذا سے جوہر کھل گیا شمشیر کا

غنیمت جان لے دل جنبش ابروئے قاتل کو — بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا

مرد تلوار کے آگے سے کہیں ہٹتے ہیں — ہم کو ابرو کے اشارہ سے ڈراتے ہو عبث

اور توکل اور استغنا کے مضامین میں بھی کبھی کبھی یہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے

جا بے تو سے آتش اگر اہل جہاں تجھ کو پھری — مرد پیچھا نہ کریں بھاگے ہوئے لشکر کا

ہم عالم ہے شکار دل شوریدہ مزاج — میں نے پہلو میں کیا شیر نیستاں تیار

پٹینا سر اپنے ماتم میں عزیز و یار کا — نقلۂ گنج لحد کی فتح کا نقارہ تھا

ان کے اشعار کا طنطنہ اور زور اپنی نظیر آپ ہے۔ آتش نے ہماری شاعری کی لے کو اونچا کر دیا۔

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ہمیشہ جھاڑتے ہیں گرد پیرہن غافل — نہیں سمجھتے کہ ہے زیرِ پیرہن مٹی

دورِ شراب حلقۂ بیرونِ در ہے یاں — اس بزم میں ہے مست ہر اک اپنے حال میں

آتش کی خمریات کی طرف بھی کما حقہٗ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ خمریات کا ذخیرہ ان کے یہاں زیادہ نہیں مگر ان کا والہانہ انداز قابلِ توجہ ہے۔

دخترِ رز ہوگی حلقہ میں جہاں اٹھے ہے نقاب — خلوتی کو اشتیاقِ انجمن ہو جائے گا

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید — سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو — آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

خمریات

اک جام میں کھلتا ہے طلسمات جہاں کا — مستی میں کسے مرتبۂ جم نہیں ہوتا

عید کا روز ہے مسکین ہیں آئے ہوئے — پیرِ خم ہم کو بھی ساقی کوئی ساغر ملتا

ساقی زلال وُہ دے جو توفیق ہو سو دے — مستوں کو تیرے ہوش کہاں امتیاز کا

اپنا دماغ خشک بھی تر ہو شراب سے — طاؤس وجد کرتے ہیں ساقی سحاب سے

معجونِ آب و گل ہی سے رہتے ہیں مست ہم — کس کو دماغ ہے مئے یاقوت رنگ کا

دیا ہے حکم جب پیرِ مغاں نے سجدۂ خم کا — کیا ہے جب شرابِ ناب سے ہم نے وضو برسوں

شرابِ کہنہ سے آلودہ یوں ہیں ہم میکش — عروسِ نو سے قربت جس طرح داماد کرتے ہیں

دورِ شراب حلقۂ بیرونِ در ہے یاں — اس بزم میں ہے مست ہر اک اپنے حال میں

ساقی سمائے اُس میں ہزاروں خم شراب — کشتی ہے گو ظرف خدا سے جہاز کا

اٹھتے ہی اس رونقِ محفل کے سب بیکار تھے — جام و مینا ساقی و مطرب رباب و چنگ و نے

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب — بس ہو چکی نماز مصلّٰی اٹھائیے

نشہ ہی میں یا الٰہی میکشوں کو موت دے — کیا گہر کی قدر جب آبِ گہر جاتا رہا

نکالے دل سے کدورت اگر صفائے قدح — نثارِ شیشہ کے ہو محتسب فدائے قدح

زمانہ میں نہیں مجھ سا کوئی دریا نوش — حباب وار ہے سر میں بھری ہوائے قدح

سبو و شیشہ و خم کس کی کی نہ پا بوسی — کسی نے منہ نہ لگایا مجھے سوائے قدح
جہاں کی سیر دکھاتا ہے نشۂ صہبا — دماغ رکھتے ہیں جمشید کا گدائے قدح
ابر دریا بار تو پہنچا قریب میکدہ — ناخدائے کشتیٔ مے ساقیٔ گلفام ہو
حجاب دور کیا کیفِ مے نے اُس بُت کا — جزائے خیر دے ساقی تجھے خدائے قدح
یہ جلوۂ مہ و خورشید سے کھلا آتش — ہنوز باقی ہے دورِ فلک میں جائے قدح

خالص عاشقانہ اشعار بھی جن میں بانکپن، آن بان کے ساتھ جلوہ افروز ہے، آتش کے دیوان میں جابجا ملیں گے۔ ؎

کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں — در کے نزدیک ہوں کبھی دیوار کے پاس
ہمارا کاسۂ سر راہ افتادہ ہے مدت سے — خدا توفیق دے ٹھوکر کی ان پائے نگاریں کو
زلفیں ہٹائے رُخ روشن سے مہرباں — اختر شناس کہتے ہیں سورج گہن میں ہے
نگاہیں مردمِ دیدہ کو ہردم یہ سکھاتی ہیں — ملے تو سٹے سے جنتی دولت دیدار بہتر ہے
جور و جفا ہزار کرے ہم خفا نہ ہوں — خوش رو سے خوش جمال سے خوش اختلاط ہے
کھا کھا کے زخم کرتے ہیں مستوں کی طرح رقص — بسمل تمہاری تیغ کے کس کس نشاط سے
شب فراق میں اک دم نہیں قرار آیا — خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری
کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہ حسن — فقیر دیکھتے ہیں راہ کو بکو تیری
اس گوش و چشم سا نہ تو دیکھا ہے نہ سنا — آتش قسم ہے ذات سمیع و بصیر کی
آہستہ پاؤں رکھئے قیامت نہ کیجئے — ٹھوکر سے فتنے ہوتے ہیں بیدار دیکھئے
چُن چُن کے قتل کیجئے انصاف شرط ہے — حاضر ہیں بے گناہ و گنہگار دیکھئے
حشر تک یوں ہی رہیں گے غمزہ و انداز و ناز — عشق عالی منزلت سے حُسن و الاجاد کے
تم اپنے چاند سے منہ کو نہ پھیرتے پیارے — خلاف ہم سے جو ہوتا سو آسماں ہوتا
ہر گھڑی ہردم ترقی ہے جمالِ یار کو — روح سے بہتر لطافت میں بدن ہو جائیگا
سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ جاتا — تم نے انداز کہیں اپنی ادا کا دیکھا
دے کے پھانسی مجھے سمجھے تقصیر کو گیسوئے یار — گردنِ اہلِ ندامت کی طرح سے خم ہوا

ذرا تنور ملاحظہ ہوں :—

گنا ہگار ہیں محرابِ تیغ کے ساجد — جھکایا سر تو ادا فرض جھکا نہ ہوا

کیا جگہ کو ہے محبوب ہے سبحان اللہ — کوئی کعبہ، کوئی جنت، کوئی گلشن سمجھا

چھوڑتا میرے گریباں کو نہیں دستِ جنوں — کیا یہ اس کو کسی محبوب کا دامن سمجھا

ہوا ہے زلف سے گستاخ کس قدر شانہ — ہمارے پاس بھی دستِ بریدہ ہوتا تھا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں — اس بت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا

نقاب الٹ کے جو منہ عاشقوں کو دکھلاتے — تمھیں کہو کہ تقاضا نظارہ کیا کرتا

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

لبِ شیریں سے وہ دشنام دیا کرتے ہیں — زہر ہو کر ہے مجھے قند مکرر ملتا

سے ہرچند حالتِ دلِ ناگفتنی تھی لیکن — رو کر کہا کچھ اس سے جو اہلِ درد پایا

اوپر کا یہ شعر آتش کی عام روش سے مختلف اور میر کے رنگ میں ہے

سا ساقی حدیث اس کو سمجھتے ہیں تیری مست — پیرِ مغاں کے منہ سے جو ارشاد ہو گیا

اے نرگسِ خود کام ملے خاک میں کوئی — تو پیروی گردشِ ایام کئے جا

گئی ہے روح بدن میں سو وجد کرتی ہوئی — عجیب حال ہوا ہے تمھارے بسمل کا

خورشید نے گرایا اس کو نظر سے — جو ذرہ تیری درگاہ بھولا

چپ ہو کیوں کچھ منہ سے فرماؤ خدا کے واسطے — آدمی سے بت نہ بن جاؤ خدا کے واسطے

قید رکھتے موسمِ گل کی نہیں — ولولے تیرے گریباں چاک کے

. . . .

آستانِ یار سے اٹھنے کا قصد آتش نہ کر — چھوڑ کر اس در کو سر دیوانے ٹکرائے گا

غیرتِ مہر رشکِ ماہ ہو تم — خوبصورت ہو بادشاہ ہو تم

ہے تمہارا خیال پیشِ نظر — جس طرف جائیں سدِ راہ ہو تم

بہ منتِ خاک ہو مقبول درگاہ — صبا کی چاہتا ہوں مہربانی

موجود کو کو تو ہے مگر چاہتا ہے شوق — آوارہ ہوں تلاش تری چار سو کریں

مجھ کو حسرت ہے حسینوں سے کہ کچھ پیار کیونکر — پادشاہوں کے لئے چینِ جبیں تھوڑی سی

مسلسل غزل جس کا مطلع ہے ؎

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا — بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
حسن تکلیف لب بام اُسے کرتا ہے — شرم سمجھاتی ہے سایہ پس دیوار نہ ہو
باغ میں آئے ہیں تو اُن کے بھی پھر لو دو گام — کبک طاؤس کا جھگڑا ہی چکانے نہ چلو

مسلسل غزل جس کا مطلع یہ ہے ؎

معشوق دے و خانۂ خالی و شب ماہ — عاشق کے لیے حاصل دنیا ہے تو یہ ہے
عاشق ہوں ہر طرح سے گنہگار ہوں تیرا — حاجت نہیں قصور کی الزام کے لیے
ترک اُلفت کا ارادہ نہ کر آتش زنہار — دل سے بیزار تو ہے جان سے بیزار نہ ہو
مردے کی طرح سوتے ہیں کیسے مری نصیب — ٹھوکر سے پائے یار کی ان کو جگاؤں میں
اشتیاق وصلت میں جان لب تک آئی ہے — عشق نے ستایا ہے حسن کی دہائی ہے
چہرۂ رنگین کی دکھلائی تصور نے بہار — بند آنکھوں کو کیا کھولا در گلزار کو
جور و جفائے یار سے ترک وفا نہ کر — لطف اس معاملہ کا نہیں انفصال میں
سچ تو یہ ہے کہ نہیں دوسرا تجھ سا کوئی — اے صنم جھوٹ نہ بولیں گے خدا رکھتے ہیں
صاف اس قدر ہے چہرہ ترا دیکھکر جسے — رنج و ملال خاطر انسان سے دور ہوں
نیچی نگاہ اُن کی ہے حیا دکی کہیں — ٹٹی شکار کی ہے حجاب بتاں نہیں
وعدہ خلاف یار سے کہیو پیامبر — آنکھوں کو روگ دے گئے ہو انتظار کا
اس بلائے جان سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے — دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست
رہتی ہیں آنکھیں بند تصور میں یار کے — نازنگہ سے اپنے بند ہے خیال دوست
مشتاق درد عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے — کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ
گل غلط، لالہ غلط، مہر غلط ماہ غلط — کوئی ثانی نہیں لاثانی و یکتا ہے وہ رُخ
لایا ہے عشق حُسن کا تیر سے کشاں کشاں — آتا تھا کون عالم ایجاد کی طرف
عاشق ہیں محو حسن جو پیدا ہو سے ستم کرو — کس کا خیال جاتا ہے بیداد کی طرف
بیت الحزن میں میرے جو یوسف کرم کرے — شادی کا بھی گذر ہو غم آباد کی طرف

دھوکہ دیا ہو دام نے کس گل کی زلف کا — بلبل اشارے کرتے ہیں صیّاد کی طرف
ایک دن تیری کمر کا طوق ہوں گے ان کے ہاتھ — اے صنم تائیدِ غیبی رکھتے ہیں مردانِ عشق
وہ دل ہے جس میں تصور ہو خوش جمالوں کا — وہ گھر ہے جس کو کہ رکھّے ہجومِ مہماں تنگ
چھڑکی ہے باغباں نے مگر خاکِ پائے یار — رکھتی ہے روئے حور کا عالم صفائے گل
واں لب ملے رقیب کے یاں دم نکل گیا — مقراضِ تارِ عمر ہوئے برگہائے گل
یار کیا مجھ کو ملا دولت پائندہ ملی — ہاتھ آیا مجھے قاروں کا خزانہ شبِ وصل
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب — زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا
بتوں کے قہر و غضب کا کیسے ہے اندیشہ — خدا نہیں یہ پیمبر نہیں امام نہیں
خیالِ خط و خال بوسۂ لب میں نہیں رہتا — عبارت بھول جاتی ہے جو مطلب یاد کرتے ہیں

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں آتش کا تخیل تمثیلی ہے وہ اکثر آنکھوں کے سامنے تصویریں کھڑی کر دیتے ہیں۔ عاشقانہ اشعار میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

جامِ شرابِ ناب ہے ساقی لیے کھڑا — گردن کو مثلِ گردنِ مینا اُٹھائیے
روئے صبیح پر نہیں لہرا رہی وہ زُلف — بو پا کے یاسمیں کی ہو بے اختیار سانپ
نہ کعبہ میں نظر آیا نہ بتکدہ میں تو — اُٹھا میں بیٹھ کے اک دم اِدھر اُدھر خاموش
اے فلک اتنا تو محفل میں فروغ اپنا بھی ہو — یار کے نزدیک بیٹھیں ہم کھڑی ہو دور شمع
بے یار دل کسی سے نہ میرا بہل سکا — کیا کیا چمک کے نکلے ہیں اختر تمام رات
زلف کو لٹکاتے ہیں رُخسار پر سو سو طرح — آئینہ ان کا مصاحب ہے مقرر بنا نہ آج
اللہ رے فروغ اُس رُخسارِ آتشیں کا — شمعوں کے رنگ مثلِ کافور اُڑاتے ہیں
ہاتھ قاتل کا مری گردن تک آ کر رہ گیا — کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا
چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

چند عاشقانہ اشعار اور سنیے:-

آمدِ یار کی کانوں سے سُنی ہے جو خبر — چھپ کے پہلو سے ہے آنکھوں کی طرف دل جاتا
مژگانِ چشمِ یار کی تعریف کیا کروں — جاں کاہ، جاں خراش، دل آزار، دلفریب
آنکھوں میں جان حسرتِ دیدار لائی ہے — آئی نہ اب اجل تو ہوئے بے اجل تمام

ہوا صفت بندی مژگاں سے ظاہر — لڑائی لیں وہ آنکھیں ڈھونڈ کر مول

عاشقانہ اشعار میں بھی اکثر ابتذال ہے۔ یہ اس زمانہ کی روش تھی ؎

بے وجہ یہ انکار ہم آغوشی کا کیا — کانٹا نہ تن اپنا ہے نہ ان کا ہے بدن پھول
ٹپکاتے زخم ہجر پہ لے ترک کیا کریں — خالی ہیں تیل سے ترے چہرے کے تل تمام
شب کو جاتا ہوں تو منہ پھیر کے وہ کہتے ہیں — نیند آئی ہے ہمیں آپ بھی آرام کریں

لکھنے والا بیباکی سے لکھ گیا لیکن پڑھنے والے شرماتے ہیں۔ لہذا ہم ان مثالوں کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ البتہ غیر مبتذل عاشقانہ اشعار ابھی اور سنیئے۔

کافی ہے ہمارے لئے دل ہی کا اشارہ — رمّال سے جفار سے کیا کام ہے ہم کو
جب جوش جنوں نے ہمیں گھر ہی سے نکالا — پھر سایۂ دیوار سے کیا کام ہے ہم کو
تجھ سا حسیں ہو یار تو کیونکر نہ اس کے پھر — ناز بجا و غمزۂ بیجا اٹھائیے
اشتیاق وصلت میں جان لب تک آئی ہے — عشق نے ستایا ہے جس کی دہائی ہے
ایسی رسائی کیجئے پیدا اک کھینچ کر — خلوت سے انجمن میں ہمیں یار لے چلے
داغ فراق و حسرت دیدار و شوق وصل — دنیا سے ہم یہ عاقبت کار لے چلے
ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ — ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھئے
آتش گناہ عشق کی تعزیر کیا کہوں — مشفق جو کچھ ہے اس کی سزا کچھ نہ پوچھئے
پھیر کر منہ کو دکھاتے ہیں وہ زلفیں یعنی — سانپ پالو تو ہیں موجود مگر گنج نہیں

؎ فراق یار میں ممکن نہیں تحمل و صبر — نہ ہو سکے گا یہ ہم سے، یہ کام مشکل کا
کہے جو یوسف انھیں کوئی تو یہ کہتے ہیں — تمہیں بھی سمجھے ہو تم، بیچنے کے قابل کا

مذکورہ بالا دونوں اشعار میں "کا" زاید ہے۔ آتش کبھی کبھی زود گوئی میں سستی بندش اور سقم زبان کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کے عاشقانہ اشعار میں گھلاوٹ بھی ہے جوش بھی ہے، بانکپن بھی ہے اور گاہ گاہ نازکی بھی:-

نیاز خادمانہ ہے وہی فضل الہی سے — بتوں کی ناز برداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
دل کو رکھ دیتے ہیں یہ کہکر کمانداروں میں ہم — اس نشانہ کو اڑا دے جو وہ تیر انداز ہو
جب چاہتے تھے لیتے تھے آغوش میں تم کو — مجبور سے رہ جاتے تھے مختار نہیں تھے

پیغامِ اجل ہوتے ہیں اس عشق کے صدمے — یا النفس سرو سے اللہ نہ ڈالے
دشمن سے سمجھتے ہیں ہم اس دوست کو بدتر — مشتاق کو منھ اپنا دکھا کر جو چھپا لے
نہیں معلوم ان آنکھوں کا ارادہ کیا ہے — کچھ اشارت میں تو مژگاں نے کیا ابرو سے
رقیب کو تری تلوار نیم جاں رکھّے — جو سرفراز ہو عاشق تو زخم کاری ہے
اب ملاقات ہوئی ہے تو ملاقات رہے — نہ ملاقات تھی جب تک کہ ملاقات نہ تھی

آتش کے عشقیہ اشعار میں ان کا فقیرانہ اندازِ گفتگو ایک خاص لطف پیدا کر دیتا ہے، محبوب کے لئے وہ اکثر شہِ حسن کی پُر زور ترکیب استعمال کرتے ہیں اور اس کے بالمقابل خود کو فقیر تصوّر کرتے ہیں۔ اس طرح آتش جب اپنے لئے فقیر کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو کبھی تو اس میں قناعت، توکّل اور کسبِ جاہ سے بے نیازی کا مفہوم مخفی ہوتا ہے اور کبھی مراد گدائے بارگاہِ حسن ہوتی ہے بعض اوقات یہ دونوں مطالب مل جُل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ انداز بہت ہی لطیف ہوتا ہے۔

پادشاہِ حُسن نے خلعت دیا ہے عشق کا — یہ علاقہ ہے ہمارے نام پر سرکار سے
اے شاہِ حسن زلف و رُخ و گوش و چشم و لب — کیا کیا علاقے ہیں تری سرکار کے لئے
تو امیر اے بتِ سرکش تو یہ عاجز ہے فقیر — حُسن جاگیر تری عشق مرا منصب ہے
محو رہتا ہوں میں یادِ حسنِ عالمگیر میں — ذکرِ سلطان مجھ فقیر سُست کا دمساز ہے
چھین کر دل کو لیا خوب کیا اے شہِ حُسن — مانگ کر ہم سے جو لیتا تو گدائی ہوتی
جب وہ شاہِ حسن نکلا گرد و پیش اسکو رہے — عشقبازوں سے سواری کا تجمّل ہو گیا
قسمت کی خوبی دیکھیئے اس شاہِ حُسن کو — دھوکا ہوا فقیر کا مجھ دادخواہ پر
بعید کیا ہے مروّت سے تری اے شہِ حسن — نگاہِ لطف سے دیکھے جو تو گدا کی طرف
کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہِ حُسن — فقیر دیکھتے ہیں راہ کو بکو تیری
کس طرف بھجوائے ہم کو دیکھئے سلطانِ عشق — کوہ و صحرا دو علاقے ہیں یہ اس سرکار کے
ہم فقیروں کو تمنّا ہے یہی اے شاہِ حسن — جھاڑتے جاروبِ مژگاں سے تری درگاہ کو
ناز و نیازِ عاشق و معشوق کیا کہوں — عجز و غرورِ شاہ و گدا کچھ نہ پوچھئے

ایک ہی غزل کے دو معمولی شعر ان دونوں مفاہیم کو واضح کر دیتے ہیں۔

نعمتِ فقر میں بھی خو نہیں تنہا خوری — بانٹ کھاتا ہوں جو ہوتے ہیں میسّر ٹکڑے

چند بوسوں سے بسر ہوئی ہے مجھ سائل کی ۔۔۔ در گہ حسن سے ہیں میرے مقرر ٹکڑے

آپ ان حد بندیوں سے تنگ آ گئے ہوں گے اور وہ بھی ایسے آزاد منش شاعر سے متعلق لہذا بغیر کسی تخصیص کے ان کے چند نشتر سن لیجئے۔

اس باغ کے ناظر نگہ پاک سے ہیں ہم ۔۔۔ گلچیں ہیں کہ آلودۂ شبنم نہیں ہوتا

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو ۔۔۔ کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

پاؤں کے چھالے تو نذر خار صحرا کر چکے ۔۔۔ پھوڑئیے اب چل کے دل کے انجمن میں آبلے

حسرت کی نگاہوں سے عیاں حال ہے میرا ۔۔۔ گویا ہوں خموشی میں تکلم سے زیادہ

کر دیا ہے یہ حوادث نے دل عالم سرد ۔۔۔ آتش حسن سے بھی گرمی بازار نہ ہو

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں نے ۔۔۔ ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

دل اسقدر گداز ہے برسوں ہی غم سے ۔۔۔ آنسو جو اپنے دیدۂ گریاں سے دور ہوں

واہ ری بے صبری واہ ری نابینائی ۔۔۔ صورت یار سے مشتاق لقا جاتے ہیں

ہنستے ہنستے تو کیا قتل گنہگاروں کو ۔۔۔ رو دیا دیکھ کے جلاد نے زنداں خالی

ناتوانی کا برا ہو گو اثر ہوتا نہ کچھ ۔۔۔ آزمانے کو تو ہم نالے مقرر کھینچتے

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر ۔۔۔ ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

سیر نعمت سے دو جہاں کی کیا ۔۔۔ دے کے شبنم کو بوند پانی کی

اڑنے دکھائی ڈنگی پروں کی طرح ستار ۔۔۔ کھینچے گا صدمہ دام میں اضطراب کا

میری تعظیم سے نے محفل سے نکالا مجھ کو ۔۔۔ اٹھتے اٹھتے نہ رہی بیٹھنے کی جا باقی

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے ۔۔۔ زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

تو لو بنا کے سرو چہ افغاں نظارہ کر ۔۔۔ تیری بلا سے میں اگر اے نازنیں جلا

پھیرا نگہ جلانے سے کیا ہاتھ آئے گا ۔۔۔ اس در کا پردہ اے نفس آتشیں جلا

دشت گردی کی نہیں دیوانہ کو کچھ احتیاج ۔۔۔ جامہ سے باہر جو ہے باہر ہے ساری شہر سے

قاتل جو اپنے پھیر لے تیری تیغ کو ۔۔۔ زخموں کے منہ کھلے نہیں جنت کے در کھلے

۱ مثلہ بالا میں اکثر مطلع بھی ہیں اور سامعین نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ آتش کے مطلع خصوصاً پر زور اور جاذب توجہ ہوتے ہیں

اکثر وہ انوکھے ہوتے ہیں اور اچانک شروع ہوتے ہیں۔ دو ایک مطلع اور سنیئے :۔

سر شمع ساں کٹایئے پر دم نہ مارئے — منزل ہزار سخت ہو ہمّت نہ ہارئے

کعبہ و دیر میں ہے کس کے لئے دل جاتا — یار ملتا ہے تو پہلو ہی میں ہے مل جاتا

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا — رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

سودے ہیں کرتے وہ جہاں نہیں سود و زیاں کا — مطلق جو پس و پیش ہوا رزانِ گراں کا

جوش و خروش پر ہے بہار چمن ہنوز — پیتے ہیں نوجوان شراب کہن ہنوز

چاند سے منھ کو ترے یاد کیا کرتے ہیں — شبِ مہتاب میں فریاد کیا کرتے ہیں

ترا نیاز مند جو اے نازنیں نہیں — دونوں جہاں میں اس کا ٹھکانا کہیں نہیں

شرف بخشا گہر کو صرف کر کے تو نے زیور میں — نگیں کو نام نے میرے بٹھایا خانۂ زر میں

سر کاٹ کے کر دیجئے قاتل کے حوالے — ہمّت مری کہتی ہے کہ احسان جلائے

ٹھیرے نہ پھر جو راہ میں تیری نکل چلے — شل ہو گئے جو پاؤں تو ہم سر کے بل چلے

مول اک نگاہ ہے جو ہو دل یار کی پسند — بڑھ کر جو لے تو آگے خریدار کی پسند

محبّت کوڑیوں کے ہو اگر مول — بنی آدم نہ لے یہ دردِ سر مول

دِل بہت تنگ رہا کرتا ہے — رنگ بے رنگ رہا کرتا ہے

اپنی زباں کو بلبلِ اندوہگیں جلا — یا برقِ نالہ سے قفسِ آہنیں جلا

ایسی وحشت نہیں دل کو کہ سنبھل جاؤنگا — صورتِ پیرہنِ تنگ نکل جاؤں گا

بہتر دکھائی دیں کہیں شمس و قمر سے آپ — دیکھیں جو آئینہ کو ہماری نظر سے آپ

قصّۂ سلسلۂ زلف نہ کہنا بہتر — پیچ در پیچ ہے خاموش ہی رہنا بہتر

دلِ بیتاب کو فریاد و فغاں کرنے دو — پہلے غمّاز ہی کو قصّہ بیاں کرنے دو

جور و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو — دل پہ ہجوم غم ہو جبیں پر شکن نہ ہو

پُر زور مطلع | اس خصوصیت میں بھی آتش غالب کے شریک اور پیرو ہیں۔ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ تخیّل اور جوش میں بھی ان دونوں شاعروں میں کافی مماثلت ہے۔ علاوہ بریں غالب کے یہاں آتش کی بازگشت بھی اکثر سنائی دیتی ہے۔ مثلاً غالب کی مشہور غزل

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کی پیشرو آتش کی یہ غزل ہے جو عروضی اعتبار سے بھی اس کے مماثل ہے

رنگِ رخسارِ گل و لالہ دگرگوں ہوگا — نہ رہے گی یہ گلستاں کی ہوا میرے بعد

آتش کا شعر ہے — کہاں وہ زلف کہاں خونِ نافۂ آہو — جو مشک سمجھے ہیں وہ لوگ ہیں خطا کی طرف

غالب نے بھی مقابلہ اور تحقیر کا یہی انداز اختیار کیا ہے ؎

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

آتش کا مطلع ہے — خشمگیں آنکھیں تمہاری آفتِ جاں ہو گئیں — برچھیاں عاشق کشی کرنے کو مژگاں ہو گئیں

غالب نے اسی زمین میں غزل کہی ہے اور اس کو آسمان کر دیا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اسی قافیہ میں جو شعر کہا ہے وہ دواوین پر بھاری ہے۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار — جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

آتش — عاشق ہوں مگر کرتے ہیں معشوق خوشامد — نازک ہے طبیعت میری بیمار کی خو سے

غالب — عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

آتش — مجھ کو بٹھلا کے یار سوتا ہے — عاشقی کی کہ پاسبانی کی

غالب — رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

اوپر کے دونوں اشعار میں طرز کی بندش یکساں ہے

آتش — جان کھونے کے لئے لازم نہیں ہے حسنِ عشق — ڈوب مرنے کے لئے چاہِ ذقن کیا چاہیے

غالب — وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

غالب کے رشک اور بدگمانی کے نقوشِ اول بھی آتش کے یہاں ملتے ہیں

؎ قاصد کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری — خط دیا لیکن نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست

آتش — خط نہ لکھا یار نے اچھا کیا تھا ناگوار — ہاتھ سے قاصد کے آنا اس کی دستاویز کا

آتش — عنایت اس کو ہے مانگو بوسہ اے شہِ حسن — فقیرِ مست کو بہتر گدائی مشکل ہے

غالب — بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

آتش کا شعر ہے۔ — طور سے کیا کیا تجلی نے — حسن بے پردہ سے خاموشی شرط

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　　　اب کسے رہنما کرے کوئی

غالب کا "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" نقشِ ثانی ہے نقشِ اول آتش کے یہاں ملاحظہ ہو

جب نہ دیکھا شعر کو کے زنخداں میں چراغ　　　　رکھ دیا ہم نے بجھا کر طاقِ نسیاں میں چراغ

غالب کا مشہور شعر ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　　　ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس کا ہیولیٰ آتش کے اس شعر میں ملے گا۔

آتش نفس ہوا ہے گلزار کی ہمارے　　　　بجلی گری ہے غنچے جب مسکرا دیے ہیں

اور یہی تعلق دونوں اساتذہ کے ان اشعار میں ہے۔

آتش　دل میں خیالِ حسنِ محبوب روز و شب ہے　　　　اترا ہوا ہے یوسف مہمان سرائے تن میں

غالب　ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے　　　　دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

آتش　دو چشمِ مست کا ساقی کے وصف ہے مقصود　　　　کنایہ ہے جو ہم کرتے ہیں ہم ثنائے قدح

غالب　ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب کے تخیل کی ایک معروف مثال اُن کا یہ شعر ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　　　جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

اُن کے تخیل نے جامِ سفال کے لئے جو ہر طرح جامِ جم سے کمتر ہے ایک پہلو برتری کا پیدا کر دیا۔ آتش اُن سے پہلے اسی انداز سے خضر پر سکندر کو ترجیح دے چکے ہیں

سبقت جو زندگی میں سکندر سے کی تو کیا　　　　پر خضر پیچھے گور کی منزل میں رہ گیا

غالب نے بہت سی غزلوں کی زمینیں آتش سے اخذ کی ہیں۔ مثلاً آتش کی ایک غزل اس طرح سے ہوتی ہے

باہر نہ پائنچہ سے ہوں اُس گلبدن کے پاؤں

غالب کی غزل کا مطلع ہے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پاؤں　　　　رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

محبوب کی ستم ظریفی کی جو غالب کی خصوصیت ہے کہیں کہیں آتش کے یہاں بھی جھلک مل جاتی ہے ؎

مرتا ہوں جو کہتا ہوں تو کہتے ہیں وہ ہنس کر　　　　عیسیٰ نہیں بیمار سے کیا کام ہے ہم کو

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ مقصود نہیں کہ غالب نے قصداً آتش کی تقلید کی۔ بلکہ یہ کہ بعض مشترک خصوصیات کی وجہ سے وہ آتش کو بہت پسند کرتے تھے (اس کا اظہار انھوں نے اپنے خطوط میں بھی کیا ہے) اور یہی اشتراک اور پسند ہم مضمون یا ہم طرز اشعار کے ذمہ دار ہیں۔ آتش کے طرز کی نشر و اشاعت ان کے تلامذہ کے علاوہ مرزا غالب نے بھی کی اور کر رہے ہیں۔ دور جدید کے اردو شعرا پر غالب اور اقبال کا اثر سب سے زیادہ پڑا ہے۔ آتش ایک کے جوش و تخیل اور دوسرے کی آزادگی اور ترنگ میں جلوہ گر ہیں۔ لیکن یہ محض ایک اثر ہے جس میں ان دونوں شاعروں کے قصد کو شاید کوئی دخل نہیں اور اگر ہے تو کسی حد تک غالب کے یہاں۔

جو رنگ مومن خاں نے اختیار کیا آتش اس میں بھی کہیں کہیں خامہ فرسائی کر گئے ہیں

مری ضد سے ہوا جو مہرباں دوست — مرے احساں ہیں دشمن پہ ہزاروں

مومن خاں کا شعر ہے ؎

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

آتش ان سے پہلے کہہ گئے ہیں ؎

دوستدار اس کا جو مجھ سا اٹھ گیا دنیا سے ہے — بیکسی پھرتی ہے کیسی ماری ماری ان دنوں

پہلا مصرعہ زود گوئی کا ماتم کر رہا ہے۔

ذوق کے یہاں استدلال کی افراط ہے اور تعلیل کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ہر چند ان میں آتش کی سی تازگی نہیں تاہم اُن پر آخر الذکر کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ استدلال کا شاعری میں کیا مرتبہ ہے اور وہ شعریت سے کس حد تک ہمکنار ہو سکتا ہے۔ انگریزی شاعری پر سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں استدلال (Ratiocination) کا تسلط رہا لیکن رومانیوں (Romantics) کی بغاوت نے اس طرز شعر کو عالم کی نظر سے گرا دیا۔ اس بغاوت کے خلاف پھر ردعمل ہوا۔ اور اٹھارویں صدی کے شعرا کچھ عرصہ کے لئے پھر اور نگ نشیں ہو گئے لیکن ان کا طرز استدلال حیات نو سے محروم رہا لیکن یہیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ انگریزی شاعری اور رومن شاعری کا استدلال محض منظوم منطقی استدلال ہے۔ اس کے برعکس مشرقی شاعری میں مذہبی مثنویوں کو چھوڑ کر دیگر اصناف سخن میں شاعرانہ استدلال ملے گا جو کہ منطقی استدلال سے بہت مختلف ہے اور اس کی شعریت میں کلام نہیں۔ تاہم استدلال کے تواتر اور کثرت کا اثر اشعار کی تازگی اور اُن کے باہمی ربط اور تسلسل خیال پر ضرور پڑتا ہے۔ استدلال کا تواتر خشکی پیدا کرتا ہے۔ بجلی بار بار چمکتی ہے تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ آتش کے اشعار پڑھتے وقت کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے۔

تکلم اور فہم کو غیر متکلم اور غیر ذی روح اشیا سے منسوب کرنا آتش کا یہ مخصوص انداز ہے اور ناسخ بھی اس میں ان کے شریک ہیں۔ اس طرز بیان کی لطافت سے کسے انکار ہوگا۔

دل سے آتی ہے محبت کے چھپے میں یہ صدا
جان پر کھیلنے والوں کو شش و پنج نہیں

یہ سودائے شہادت ہے ہمارے سر کو لے قاتل
تری تلوار کا دم بھرتی ہے جو رگ ہے گردن میں

بولی یہ روح پھینک کے پتلا رہ جسم کا
بھاری ہے بوجھ کون یہ بیگار سے چلے

صدا یہ صید گاہِ عشق میں آتی ہے برسوں سے
نشانہ تیر کا ہو راہ کر فتراک سے پیدا

نگاہیں مردمِ دیدہ کو ہر دم یہ سکھاتی ہیں
ملے لوٹے سے جتنی دولتِ دیدار بہتر ہے

صفِ مژگاں سے کہہ رہی ہے وہ چشم
دل ملیں جتنے، بے تحاشا لوٹ

صدا یہ صید گاہِ عشق میں آتی ہے برسوں سے
نشانہ تیر کا ہو راہ کر فتراک سے پیدا

آتش کے یہاں چھوٹی بحر کی غزلوں میں غضب کی روانی ہے۔ میں صرف تبصرہ کے بجائے چند غزلیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

دل بہت تنگ رہا کرتا ہے
رنگ بے رنگ رہا کرتا ہے

حسن میں تیرے کوئی عیب نہیں
قبح میں دنگ رہا کرتا ہے

صلح کی دل سے ہیں یاں مصلحتیں
واں سرِ جنگ رہا کرتا ہے

دل مرا پی کے محبت کی شراب
نشہ میں بھنگ رہا کرتا ہے

گفتنی حال نہیں ہے اپنا
کچھ عجب ڈھنگ رہا کرتا ہے

منزلِ گور کے دیوانوں کو
سینہ پر سنگ رہا کرتا ہے

عالم وجد ترے مستوں کو
بے دف و چنگ رہا کرتا ہے

ترے گوش شنوا کا مشتاق
ہر خوش آہنگ رہا کرتا ہے

بندش چست سے تری آتش
قافیہ تنگ رہا کرتا ہے

جاں بخش لب کے عشق میں ایذا اٹھائیے
بیمار ہو کے نازِ مسیحا اٹھائیے

قدسی نگاہ لطف کے امیدوار ہیں
آنکھیں تو سوئے عالمِ بالا اٹھائیے

تجھ سا حسیں ہو یار تو کیونکر نہ اس کے پھر
نازِ بجا و غمزۂ بیجا اٹھائیے

سختی راہ کھینچیے منزل کے شوق میں
آرام کی تلاش میں ایذا اٹھائیے

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھائیے

جام شراب ناب ہے ساقی لئے کھڑا — گردن تو مثل گردن مینا اٹھایئے

جوش جنوں میں دیکھئے پیچھے نہ مڑکے پھر — منہ جس طرف کو صورت دریا اٹھایئے

دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے — کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا — بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہید دل میں داخل ہوئے ہیں — گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں — مریدان پیر مغاں کیسے کیسے

عجب کیا چھٹا روح سے جامۂ تن — لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

نہ مڑکر بھی بے درد قاتل نے دیکھا — تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا — مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا — توانا کئے ناتواں کیسے کیسے

دل و دیدۂ اہل عالم میں گھر ہے — تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں — ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ترے کلک قدرت کے قربان آنکھیں — دکھائے ہیں خوش رو جواں کیسے کیسے

حسن کس روز ہم سے صاف ہوا — گنہ عشق کب معاف ہوا

مے پیا شکر کرکے ساقی سے — دُرد اُس میں ہوا کہ صاف ہوا

زہر پر ہنر ہوگیا مجھ کو — درد درماں سے کالمضاف ہوا

خاکساری کی ہوچکی معراج — سینہ اپنا زمیں صاف ہوا

اس کمر کے ثبوت میں عاجز — فکر کو کرکے موشگاف ہوا

خط سے اس رخ کا حل ہوا مطلب — شرح سے متن کا کھلا مطلب

تو وہ مرجع ہے جس سے رکھتے ہیں — کافر و رند و پارسا مطلب

منزل گور میں وصال ہوا — گوشہ میں پہنچے ہوگیا مطلب

التجا ہے یہی زباں سے مجھے — گوش سے ہو نہ آشنا مطلب

دہن تنگ تم کو ملنگا ایسا منہ ہو — میرے قاتل کو مرحبا مطلب

اے شہ حسن ہم فقیروں کو — ہے زباں سو تری دعا مطلب
ذہن و زلف کا میں مائل تھا — کبھی آ بھا کبھی مُڑ کا مطلب
شاعر حال گو تھا میں آتش — میرے ہر شعر میں بتدعا مطلب

مقطع میں آتش نے اپنی شاعری کے متعلق دعویٰ کیا ہے جو ایک حد تک صحیح ہے۔ غزل گویان عصر کی بہ نسبت ان کے یہاں مشاہدہ اور واقعہ کو زیادہ دخل ہے

فتنہ عشق کا اثر ہی شرط — لب خشک اور چشم تر ہی شرط
قابل گوش سینکڑوں گوہر — گوش بھی قابل گہر ہی شرط
یہ تمنا ہے بندگی تیری — اس قدر ہو کہ جس قدر ہی شرط
عشق میں صبر کار مشکل ہے — دل کے خوں کرنے کو جگر ہی شرط
طور سے کیا کیا تجلّی نے — حسن بے پردہ سو حذر ہی شرط
جھوٹے سچوں کا دیتے ہیں دھوکا — جوہری کے لئے نظر ہی شرط
معرکہ عشق کا ہے یاں آتش — پاؤں پر تیغ زن کے سر ہی شرط

اور وہ غزل جس کا ذکر پہلے آچکا ہے ؎

غیرت مہر رشک ماہ ہو تم — خوبصورت ہو بادشاہ ہو تم
کیونکر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ — کیسے خوش چشم خوش نگاہ ہو تم
ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ — جامہ زیبوں کے بادشاہ ہو تم
کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے — ہم گنہگار بے گناہ ہو تم
ہے تمہارا خیال پیش نظر — جس طرف جائیں سدراہ ہو تم

؎ تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا — ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا
چلے گا کبک کیا رفتار تیری — یہ انداز قدم پایا تو ہوتا
بجا لاتے اسے آنکھوں سے لے دوست — کبھی کچھ ہم سے فرمایا تو ہوتا
کہے جاتے وہ سنتے یا نہ سنتے — زباں تک حال دل آیا تو ہوتا
سمجھتا یا نہ اے آتش سمجھتا — دل مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

ہ شب فرقت میں یاد جانی کی | درد پہلو نے مہربانی کی
منہ دکھاؤ بہت رہی تکرار | ارنی اور لن ترانی کی
کر دیا یہ ہوگئی غائب | سن کے دھوم اپنی ناتوانی کی
سیر نعمت سے دو جہاں کی کیا | دے کو شبنم کی بوند پانی کی
ہوگیا عشق حسن سے ناگاہ | پوچھتے کیا ہو ناگہانی کی
لب جاں بخش کے قریب ہے خط | شرح ہے متن زندگانی کی
گوش زد ہوتے ہی ہوئی دشمن | نیند تیری مری کہانی کی
مجھ کو بہلا کے یار سوتا ہے | عاشقی کی کہا سبانی کی
رہ گیا شوق منزل مقصود | پائے خفتہ نے سرگرانی کی
مثل شبنم ہوں صاف دل قانع | مجھ کو دریا ہے بوند پانی کی
برق چمکی تو سر فراز کیا | ابر آیا تو مہربانی کی
راحت مرگ کو نہ پوچھ آتش | نہ رہی قدر زندگانی کی

ہ عجب تیری ہے اے محبوب صورت | نظر سے گر گئے سب خوبصورت
جبیں پر سے کر و چیں و شکن صاف | حسینوں کو ہے یہ معیوب صورت
وہ عاشق ہوں مرے آگے ہے آتا | بنا کر حسن خوش اسلوب صورت
ہلا دیں دل نہ کیونکر شعر آتش | صفا بندش ہے معنی خوبصورت

مقطع سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ آتش کو اپنے اشعار کے متعلق آمد کا گمان نہ تھا۔ انھیں مشق سخن کی ضرورت اور اپنے اعلیٰ تخیل دونوں کا احساس تھا جبھی تو کہتے ہیں

ع۔ صفا بندش ہے معنی خوبصورت

اور ہر بڑے شاعر کی طرح وہ تحریف اور ترمیم اور جد و جہد کو شعر کی تاثیر کا پیش خامہ جانتے تھے۔ پہلے مصرع کو دوسرے سے ربط دیجئے یہی مضمون نکلے گا

ہ دہن یار میں نہ آئی بات | شاعروں نے بہت بنائی بات
قصہ کوتہ دہان یار کا تھا | تجنتوں نے مری بڑھائی بات

دہن تنگ یار میں کیا کیا　　　　تنگ ہو ہو کے ہے سمائی بات

ان تینوں اشعار میں ایک ہی مضمون کو نئے نئے پہلو دئے ہیں۔

کہیں زلفوں کو ہو اُلجھ پڑنا　　　　اُن کی آنکھوں کو ہو لڑائی بات
نازکی نشکر کی کبھی نہ گئی　　　　جب سُنائی نئی سُنائی بات
دم ہے جس جبین یاد سے نیند　　　　کرنے دیتی نہیں رکھائی بات
کہہ گئے تم کنا یہ میں کیا کیا　　　　نہ کسی نے تمھاری پائی بات
تم جو گویا ہوئے تو پھول جھڑے　　　　غنچہ سے منہ میں رنگ لائی بات
یہ صدا آتی ہے خموشی سے　　　　منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات
تیرے شیریں کلام کو سُن کر　　　　پھر نہ آتش کی بھائی بات

ے　　بلا اُس زلف پیچاں کا ہے ہر پیچ　　　　خم اندر خم ہے ہر ہر پیچ در پیچ
تری دستار پر عاشق کُشی کو　　　　ستم ہے گوشوارہ قہر سر پیچ
الٰہی خیر کیجو کھا رہی ہے　　　　اُدھر وہ زلف اِدھر نازک کمر پیچ

چھوٹی بحور کی یہ غزلیں انتخاب کے ساتھ اس لئے پیش کردی گئی ہیں کہ سامعین اپنے طور پر اُن کے حسن و قبح کو جانچ سکیں یہ غزلیں غالب کے آخری دور کی سہل و ممتنع غزلوں کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ آتش اور غالب کی بیشتر خصوصیات مشترک ہیں۔ دونوں شاعروں کے طبائع میں بنیادی اختلاف تھا جس نے اُن کے نقطہ ہائے نظر میں بہت بُعد پیدا کردیا ہے۔ غالب کے یہاں طغیانی بہت کم ہے۔ اعتدال اور توازن اور ان ہی کی پروردہ خصوصیات نفاست اور لطافت اور اشارہ اور کنایہ ان کی شاعری کے جوہر ہیں۔ آتش کے یہاں اس کے برعکس جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اعتدال اور لطافت کنایہ اور اشارات شاذ ہی ملیں گے۔ چنانچہ آتش کی ظرافت غالب کی شوخی کے مقابلہ میں بھونڈی ہے اور کہیں تو ابتذال کے دلدل میں پھنس جاتی ہے۔

روتا ہوں تو کہتا ہے وہ ہنس کر مجھ سے آتش　　　　یہ کیا آزار ہے تجھ کو نہیں بچتا جوانی پر
راہ میں اکثر کنواں بنواتے ہیں لوگ آپ بھی　　　　فی سبیل اللہ یہ چاہ زنخداں کیجئے

ذرا بے تکلفی اور صاف گوئی ملاحظہ ہو ے

آرزو ہے یہی آتش کی خدا سے اے دوست　　　　تیری پاپوش سے اک دن سر دشمن ٹوٹے

یاد میں تیری رقیب روسیہ جاگا تو کیا
مرتبہ عالی نہ ہو خفّاش شب بیدار کا

چھدایا یار کے گھر میں تو کیا کیا کم تھا
جو کچھ کہ ہمت عالی جناب سے ہوتا

دربان یار مجھ پر شفقت اگر نہ کرتا
دیوار پھاند جاتا میں دگر رند کرتا

مائل معشوقہ خسرو یہ ہوا ہے کوہکن
شیر کے جھوٹے کو کھانا کام ہو روباہ کا

اے صنم تیری کرنجی آنکھ سے ثابت ہوا
رنگ اُڑ جاتا ہے روئے مردم بیمار کا

گویا آتش ظرافت میں بھی استدلال اور تمثیل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔
آتش بعض اوقات سنجیدہ ہوتے ہیں لیکن قارئین اس میں ظرافت کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔

نبض سی لگتی ہو ٹھنڈی سانس ہجر یار میں
روح قالب میں نہیں زنبور پیراہن میں ہو

کٹ جائے وہ زبان ہو جس سے دعائے خیر
پھوٹے وہ آنکھ جو کہ نہ وقت سحر کھلے

زباں وہ گنگ ہو جس سے نہ آفریں نکلے
وہ گوش کر ہو جو آتش سخن پسند نہ ہو

لیکن انھوں نے ظرافت میں دلخراش اشعار بھی کہے ہیں۔

نہ کہہ رندوں کو حرف سخت واعظ
درشت اہل جہنم کی زباں ہو

ایک بوسہ مانگنے پر دے کے لاکھوں گالیاں
بخل میں قارون سخاوت میں بُت حاتم ہوا

نہیں مٹتی ہے پتھر کی لکیر احباب کہتے ہیں
مٹے گا پائے بت پر نقش اپنی جبہ سائی کا

چھپ کے آؤ آشکارا میرے گھر آئے تو کیا
اجر ہے اُس کا بڑا جو خیر پنہاں کیجئے

تم تو غریب خانہ میں آئے نہ ایک روز
فرمائیے تو شب کو کسی وقت آؤں میں

مشتاق بندشوں کے ہیں تو اُن کو چاہئے
بندھوائیں شاعروں سے جو اُن کی کمر کھلے

کیا کہوں یار سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے
حضرت دل جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

روسیہ دشمن عبث کرتا ہے میری برابری
بندۂ زنگی بناوٹ سے نہ صاحبزادہ ہو

ظاہر ہو گیا ہوگا کہ آتش کی ظرافت میں لطافت نہیں درشتی ہے۔ اشارہ نہیں صراحت ہے۔ اور صراحت لطیفہ دشمن ہے۔ ان کی ظرافت کی چند مثالیں اور پیش کرتا ہوں۔

اُلٹی ہے منت ان کی تجھے بوسہ ہی ملے گا
آتش حرکت قابل دشنام کئے جا

مجھ سے ہر بات میں قرآن وہ اٹھواتا ہے
گردن یار میں شاید ہو حمائل بھاری

اے فلک کچھ تو اثر حسن عمل میں ہوتا | شیشہ اک رات تو قاضی کی بغل میں ہوتا

کہیں کہیں ان کے مزاحیہ اشعار کوئی مضحکہ خیز منظر پیش کرتے ہیں ۔

چھکڑا ہوئے ہیں سوچ کے راہ وفا میں پاؤں | پہیئے لگائیے انھیں رفتار کے لئے

نہ پھول بیٹھ کے بالائے سرو لے قمری | چڑھے جو بانس کے اوپر یہ کام ہے نٹ کا

رکھتے ہیں لے ٹپ ترے سر پر ٹھہانے کے لئے | گنبد دستار سے زاہد مکاں بالائے سر

خوں ریز جیقد رکہ ہو اس سے عجب نہیں | آتش فراق یار ہے [illegible] کا

کہیں کہیں اُن کی ظرافت تلخ اور مہیب (Gruesome) ہو جاتی ہے اور یہ طنز کی بدولت [illegible] اشعار کس قدر پُر زور ہیں :-

قدر دیوانہ کی بے ہنگامۂ طفلاں نہیں | چاہیئے سالا بالشکر کو رہے لشکر کے ساتھ

سفید مو ہوئے ترک قدح کشی کیجئے | عوض شراب کے رکھئے خضاب شیشہ میں

اپنی شرارتوں سے نہ باز آئے آسماں | کو دک مزاجی مجھ کو خوش آتی ہے پیر کی

آخر میں چند باتیں آتش کی شخصیت کے متعلق بھی سُن لیجئے ۔ ہم اپنی جستجو کو ان کے کلام کے اشارات تک محدود رکھیں گے ۔ قناعت اور توکل ، قلندری و آزادی ، بد دماغی و حُسن پرستی ، اعتماد اور تفاخر ، جذبات کی طغیانی اور ضبط کا فقدان اور باوجود اس کے سلامت روی اور وضعداری یہ اُن کی خصوصیات تھیں جن پر ان کے اشعار شاہد ہیں ۔ حسن پرستی جس میں امرد پرستی کے نقوش بھی ملتے ہیں ان کے مزاج کے عناصر ترکیبی میں سے تھی ۔

تری کلک قدرت کے قربان آنکھیں | دکھائے ہیں خوش رو جواں کیسے کیسے

صبا کی طرح ہر اک غیرت گل سے ہیں لگ چلتے | محبت ہے سرشت اپنی ہمیں یارانہ آتا ہے

ع - حُسنِ امرد کا بہت مائل دلِ بے باک ہے

شاعروں میں کوئی آتش سا نہ ہوگا حسن دوست | خوبصورت پر پڑی جب آنکھ مائل ہو گیا

شریف کعبہ کو کعبہ مبارک ہم تو اے آتش | بتوں کے گھورنے کو جاتے ہیں دیر برہمن میں

دیکھا گیا ہے کہ نازک مزاجی اکثر استغنا کے ہمرکاب ہوتی ہے اور ہمارے آزاد منش شعرا کا دامن تو اس نے کبھی چھوڑا ہی نہیں ۔ علاوہ بریں کم دماغی میں زمانہ کی قدر دانی اور خصوصاً شاگردوں کی کثرت اور ستائش کو بھی دخل ہوتا تھا ۔ میر کی طرح ناسخ اور آتش کی کم دماغی کے قصے بھی صاحب آبِ حیات ہمیں سُنا چکے ہیں ۔ اب براہ راست آتش کی زبان سے ان کی کم دماغی کا اعتراف سنیئے ۔

ہوتا ہے گل کے سونگھنے سے دونا گرفتہ دل | مجھ سا بھی بد دماغ کم اس بوستاں میں ہے

نازک حبابِ جُو سے بھی میرا مزاج تھا　　راس آئی اس چمن کی نہ آب و ہوا مجھے

آتش کی خمریات پڑھنے کے بعد اُن کی مے نوشی میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایک طرف ان کی طبعی آزادگی اور حُسن پرستی اور دوسری طرف زمانہ کی رفتار ان کو دخترِ رز کی طرف کشاں کشاں لے گئی ہوگی۔ لیکن دامن کے ساتھ ان کا دل آلودہ نہیں ہوا۔ ان کی جوانمردی اور فراخ دلی کا اعلان ان کے دیوان کے ہر صفحے پر ملتا ہے۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں

کروں میں شکرِ الٰہی کہاں تلک آتش　　درون صاف دیا پاک اعتقاد کیا

وہ یقیناً راسخ الاعتقاد تھے۔ خالق اور تقدیر، دوزخ، جنت۔ انبیاء و ائمہ سب کے متعلق انھیں کامل یقین تھا جسے عین الیقین کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں وہ دنیا سے بیزار تھے۔

وعدہ وصال کا ہے اندھیرے میں گور کے　　شمعِ حیات جلد کہیں ہو بھی جائے گُل

اور جسم کی قید سے نالاں اور وصالِ حقیقی کے بے تابی کے ساتھ منتظر۔ وہ شعراء اور متصوفین کی شریعت کے پیرو تھے جس میں اختلافِ مذاہب کا داخلہ ممنوع ہے اور جہاں دل آزاری سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ؎

رند مشرب ہوں مجھ کو کیا ہو شے　　مذہبوں میں جو اختلاف ہوا

بتخانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے　　دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

حاصل ہوا نہ خاک بھی آپس کی نزع سے　　دل میں غبار کافر و دیندار سے چلے

دل کی کدورتیں اگر انساں سے دور ہوں　　سارے نفاق گبر و مسلماں سے دور ہوں

مگر افسوس ہے کہ یہ کدورتیں آتش کے دل سے بھی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھیں اور لکھنؤ کی فضا میں بھی کیسے سکتی تھیں چنانچہ کبھی کبھی ایسے شعر بھی کہہ جاتے ہیں :-

بندگی پیشوا کی لازم ہے　　روسیہ منکر امامت کا

ظاہر ہے کہ آتش باوجود فراخ دل ہونے کے روادار نہ تھے۔ خواہ رقابتِ شعری ہو خواہ مذہبی اختلاف، وہ تحمل اور ضبط کے بجائے سخت ناگوئی پر اُتر آتے تھے۔ یہ بات جتنی بار دہرائی جائے کم ہے کہ اعتدال سرے سے ان کی فطرت میں ہی نہ تھا۔ اور ضبط کو وہ نامردی سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں غالب کی آزاد خیالی اور وسعتِ نظر کی جستجو بے سود ہوگی یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے مزاج سے وہ زیادہ میل نہیں کھاتے تاہم لکھنؤ کے دیگر شعراء اور اُردو کے بہت سے شعراء کی بہ نسبت بہت زیادہ آتش کو تقدیر کا قوی احساس تھا اور وہ جدوجہد کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے ؎

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے　　پھیلایئے نہ ہاتھ نہ دامن پسارئیے

طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار　　زر کی طمع میں چھانتے ہیں خاک نیاریے

ان کے اشعار سے ہی ان کا مذہب بھی معلوم ہو جاتا ہے ؎

ساغر صاف مئے حبِّ علی مشرب ہے　　مرد مومن ہوں میں اثنا عشری مذہب ہے

مومن کا مددگار ہو شاہ نجف لے دل　　حامی ہے ترا شیر خدا لا تخف اے دل

حاصل اُسے تو قلزم قدرت کا سمجھ لے　　گو ہر ہے علی کون و مکاں ہو صدف اے دل

کچھ قناعت اور کچھ طبیعت کی بدولت شگفتہ مزاجی کی دولت میسر آگئی تھی۔

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ　　قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

اور افکار کو تو وہ بہر حال پاس نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ افکار میں سے اُن کے لئے صرف ایک فکر تھی ۔ فکر شعر۔ دنیائے دنی اور حیات فانی ان کی نظر میں اس قابل ہی نہ تھی کہ انسان ان کے لئے اپنا عیش منغص کرے۔ حاصل کلام وہ ایک زندہ دل خوش طبع عیش پسند، آزاد خیال اور توکل پیشہ بزرگ تھے جنھیں اپنے کمالات اور انفرادیت کا شدید احساس تھا، اور اسی احساس نے ان کے کلام کو زیادہ پُر زور بنا دیا ہے ؎

شجر قدس ہیں ہم عالم میں　　اس چمن میں نہیں پیوند اپنا

ان کے بعض اشعار کی سادگی پتہ دیتی ہے کہ ان کی طبیعت پر تہذیب کا ملمع پورے طور سے نہیں ہونے پایا تھا۔ شاہدانِ بازاری سے رسم و راہ تھی ورنہ کم از کم ان کے قدر دان ضرور تھے۔

آفتِ جاں ہے ترا اے سرو گل اندام رقص　　ساتھ ہر ٹھوکر کے کرتا ہے ہمارا کام رقص

حرص دنیا حسن تمارتگر کو رکھتی ہو خراب　　بہر زر کرتے ہیں محبوبانِ سیم اندام رقص

آشنا ہوتے ہیں مفلس کے کہاں یہ لالچی　　زر کی خواہش ان حسینوں کو ہو زیور سے غرض

معشوق سے اُمیدِ وفا ہے خیالِ خام　　وعدہ دروغ یار کا قول و قسم غلط

رنگ میں بھی وہ انتہا پسند تھے، ملاحت کی تعریف میں ان کے یہاں ایک دو سے زیادہ اشعار نہیں اور وہ بھی نمک کی رعایت کے لئے لیکن محبوب کے سفید فام ہونے کا تذکرہ جا بجا ہے۔ بے شمار جگہ "نور کے بکّوں" کی توصیف ہے ؎

کہوں کیونکر نہ ان کو نور کے بکے وہ ذرصالے　　اندھیرے میں اُجالا چاند سے وہ چند کرتے ہیں

نُور کا بُکا نہیں کوئی حسین پارسا　　روشنی مہر ہے چاند سے رُخسار و نہیں

اوّل تو وہ محبوب کی صباحت پر مفتوں تھے پھر خال کے دلدادہ تھے ؎

قدرت اللہ ہے نیرنگ سازی حسن کی ۔۔۔ گورے گورے عارضوں پر کالے کالے تل کہاں

سیاہ خال اور صبح عارض بھی آتش کے یہاں دیتے ہیں۔ ان کے بعد اُن کی توجہ محبوب کے خال کی طرف تھی۔ اور انھوں نے اکثر کیفیات کو محل کیا ہے ۔۔۔ وہ شوخی رفتار، صباحت اور خال پر فریفتہ تھے۔ اُن کے یہاں محبوب کی رسمی تعریفیں بھی ہیں مگر تکرار انہی تین خصوصیات کی ہے لہٰذا ان کے مذاقِ حسن کے متعلق ہم تیقن سے رائے قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن کلام میں جو عادی ہیں اُن سے نتائج نکالتے وقت آتش کے اس نیم سنجیدہ اعتراف کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

آتش برا نہ مانئے حق حق جو پوچھئے ۔۔۔ شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

آتش کے کلام میں زمانہ کا عکس کئی طرح سے ملے گا۔ اوّل تو ان کے اشعار میں لکھنؤ کے دبستان شاعری پر تقلیدی اور اجتہادی دونوں حیثیتوں سے روشنی پڑتی ہے۔ تقلیدی تو یہی رعایت اور التزام مالایلزم میں اور اجتہادی آزادگی ندرت اور تازگیٔ خیال میں، ان کی شخصیت اور ان کی شاعری کی ترکیب کچھ تو زمانہ کی خصوصیات اور کچھ ان کے خلاف ردّ عمل سے ہوئی تھی۔ ان دونوں میں کہیں زمانہ اور ان کے مزاج کا تصادم اور کہیں امتزاج ملتا ہے اس کی مثالیں پہلے آچکی ہیں۔

کم شاعری بھی نسخۂ اکسیر سے نہیں ۔۔۔ مستغنی ہوگیا جسے آیا یہ فن درست

قادر الکلام شاعر فکر معاش سے بے نیاز کر دیا جاتا تھا۔ نوابین اور روسا کی سرپرستی ایک طرف اور عوام کی قدردانی دوسری طرف شعرا کو افلاس کے جنگل سے نکال لیتے تھے۔

اس زمانہ میں عملیات کا بہت چرچا تھا۔ اس کی تلمیحات آتش کے کلام میں ملتی ہیں۔ اُن سے عہد کا انعکاس بھی ہوتا ہے اور آتش کے رجحان کا پتہ بھی ملتا ہے ؎

قبروں کو عاشقوں کی نہ کھدوا ستم نہ کر ۔۔۔ بے دردیوں عمل نہیں کشفِ قبور کا
گریہ سے اپنے اس گل خنداں کو آیا رحم ۔۔۔ تسخیر قلب کرتے ہیں ہم نقش آب سے
کیا کیا پریاں اتاری ہیں شیشہ میں آہ نے ۔۔۔ جن کون سا فتیلہ سے لپٹے نہیں جلا

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلّط کے متعلق دیے ہوئے اشارے ملیں گے

پر کترتا ہے مرے صیاد تو کاٹ اس طرح ۔۔۔ حسرت پرواز بھی اُڑ جائے بال و پر کے ساتھ
ساقی بہار گل کی رعایت ضرور ہے ۔۔۔ لالہ کے پھول سے ہو شراب فرنگ سرخ
ہوگی نئی طرح سے نہ لے تُرک خوشنما ۔۔۔ پہنے پھرے لباس سیاہ فرنگ سرخ
شاخِ گل پر سے کیا تھا بسکہ بلبل کو اسیر ۔۔۔ ہاتھ پر صیاد نے بٹھلا لیا پر توڑ کر

الغرض آتش کے یہاں دو لہریں پہلو بہ پہلو رواں دواں ملتی ہیں: سادگی اور مضمون آفرینی، ایک طبعی ہے ایک زمانی مگر زمانی میں آتش کے تخیّل کی کارفرمائی ہے جو اس کے لئے حیاتِ ابد کی ضامن بن گئی ہے۔ رندی، سرمستی، قلندری آزادگی، جوش اور ترنگ، تحیّر اور بے ساختگی یہ تو سادگی کی ذیل میں آتی ہیں۔ تمثیلات و تشبیہات، تلمیحات وجدّت ادا تعلیل و استدلال، مضمون آفرینی سے متعلق ہیں۔ اور تخیّل اُن کا منبع و ماخذ ہے۔ ان کا توکّل ہماری شاعری میں بے نظیر ہے اور اُن کی پُرصد انفرادیت عدیم المثال۔ ان کے عاشقانہ اشعار بانکپن اور گھلاوٹ میں کسی شاعر سے کم تر نہیں ان کی تازگیٔ نظر پردہ برانداز ہے اور اُن کا عظیم المرتبت تحیّر ہمارے لئے مایۂ ناز ہے۔ مضمون اور طرزِ ادا کی جدّت اور تضاد اور کہیں کہیں لطیف رعایت، نگاہ کی تازگی اور طرزِ ادا کی سادگی کا شمار ان کے محاسن کلام میں ہے۔ تمثیل۔ تعلیل اور استدلال میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ غالب پر ان کا کافی اثر پڑا۔ مرزا کے یہاں اکثر خواجہ کی بازگشت ملتی ہے۔ آتش کے یہاں تخم بہت ہیں افسوس ہے کہ اُنھیں سنگلاخ زمین ملی۔ یہ تخم غربت میں جاکر پنپے اور تناور درخت بن گئے۔ افسوس ہے تو یہی کہ رعایت اور عروضی قیود نے انھیں پابجولاں رکھّا اور زودگوئی اور ابتذال کے دھبّے ان کے کمال کے دامن پر رہ گئے۔ لیکن پھر بھی انھوں نے ناسخ کی تقلید اور گمراہی سے ہماری شاعری کو بچا لیا۔ بڑھتی ہوئی نسائیت سے نجات دیکر مردانہ لب ولہجہ عطا کیا اور مردانہ صفات، غزل میں واقعات مشاہدات، ماحول اور دیسی مواد اور مشاہدہ داخل کرکے انھوں نے اس تنگنائے میں وسعتیں پیدا کردیں۔ اس مُرجھائے ہوئے پھول میں تازگی کی لہر دوڑا دی۔ اور تسلسل سے اس کے اشعار کے باہمی رابطہ کو قوی کردیا۔ آتش کی تاریخی اہمیت ان کی شاعرانہ عظمت سے کم نہیں۔

سیّد حامد

مطبوعہ بجنور پریس - بجنور
پرنٹر:- عبدالغفور خاں (نواب)
پبلشر:- جناب بی - این کھنہ صاحب
پبلیسٹی آفیسر - ضلع بجنور
بار اوّل - تعداد - ۵۰۰ - دسمبر ۱۹۳۴ء
قیمت فی جلد .. .. عہ